نقطے سے نقطے تک

غلام الثقلین نقوی

نُقطے سے نُقطے تک

غلام الثقلین نقوی

کلاسیک چوک ریگل دی مال، لاہور

باراوّل اکتوبر 2001ء

قیمت -/100 روپے

ناشر: آغا امیر حسین
کلاسیک ریگل چوک (مال) لاہور
فون: 7312977 فیکس: 7323963
ای میل: classic_spt@hotmail.com
طابع: زاہد بشیر پرنٹرز۔ لاہور
کمپوزر: راشد حبیب نقوی

انتساب

عزیزان ظہیر، عفت، صغیر، نصیر اور مشیر کے نام

جن سے

توقّع ہے کہ وہ اس مجموعے کو اپنے والد کی طرف سے

برگِ سبز است تحفۂ درویش سمجھ کر قبول کریں گے۔

مصنّف کی دیگر کُتب

١۔ بند گلی (افسانے)

٢۔ لمحے کی دیوار (افسانے)

٣۔ نغمہ اور آگ (١٩٦٥ء کی جنگ کے پس منظر میں افسانے)

۴۔ شفق کے سائے (افسانے)

۵۔ دُھوپ کا سایہ (افسانے)

٦۔ سرگوشی (افسانے)

٧۔ اک طُرفہ تماشا ہے (مزاحیہ مضامین)

٨۔ میرا گاؤں (ناول)

٩۔ ارضِ تمنا (مکہ و مدینہ کا سفر نامہ)

١٠۔ چل بابا اَگلے شہر (لندن اور ویلز کا سفر نامہ)

١١۔ تین ناولٹ (چاند پور کی نینا، شمیرا، شیر زمان)

ترتیب



دیباچہ

نقوی صاحب کی ادبی فتوحات میں ناول، ناولٹ، سفرنامے، زندہ اور مرحوم شخصیات کے خاکے، تنقیدی مضامین، انشائیہ نما مضامین، صحافتی کالم اور بہت کچھ شامل ہے مگر ان کی پہلی محبت "اردو افسانہ" ہے۔ افسانے کی وساطت سے وہ ادبی دنیا سے متعارف ہوئے اور افسانہ لکھتے لکھتے ہی انہیں وہ اسلوب ہاتھ آیا جو مُردہ اور مستعمل لفظوں میں نئی زندگی اور تازگی کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ یہ اسلوب اب غلام الثقلین نقوی کی اردو ادب میں پہچان بن گیا ہے۔

"نقطے سے نُقطے تک" نقوی صاحب کے افسانوں کا ساتواں اور تازہ مجموعہ ہے۔ اس میں ان کے چودہ افسانے شامل ہیں۔ سات اور چودہ کا سنجوگ عجب اتفاق ہے! سات اور چودہ کے ہندسے الگ الگ اپنی علامتی معنویت بھی رکھتے ہیں۔ سات کا تعلق اساطیر سے اور چودہ کا رشتہ "نفوس مقدسہ" سے جا ملتا ہے۔ سات اور چودہ کے ملاپ کو "قران السعدین" سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

نقوی صاحب نے آج سے آدھی صدی پہلے جب اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کیا تو نیا نیا پاکستان وجود میں آیا تھا اور اس کی ستر فیصد سے زائد آبادی دیہات میں بستی تھی مگر اردو افسانہ مغربی فکشن کے تتبع میں لکھا جا رہا تھا۔ نقوی صاحب نے اس میلان کے برعکس پاکستانی دیہات کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔ نقوی صاحب کی اوائل زندگی دیہات میں گزری تھی۔ وہ دیہات کے رہنے والوں میں جن میں بنیادی حیثیت "کسان" کو حاصل تھی اس کے مزاج اور مسائل، دکھ سکھ، امید و بیم اور صبر و توکل سے آشنا تھے لہٰذا انہوں نے جب کسان کو اس کے مزاج اور مسائل کے حوالے سے افسانے کا موضوع بنایا تو اس میں پاکستانی دیہات کی مٹی کی خوشبو از خود شامل ہوتی چلی گئی اور اس نے ناقدین ادب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ یوں نقوی صاحب کی اوّلین پہچان دیہات نگاری قرار پائی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ جملہ دیکھئے:

"غلام الثقلین نقوی نے دیہات کے کرداروں کو بڑی نفاست، خلوص اور جذبے کے تحت پیش کیا ہے مگر کم لوگوں کو اس بات کا احساس ہے کہ انہوں نے ان کرداروں کے عقب میں ایستادہ بنیادی کرداروں مثلاً" درانتی، کدال، پانی، ہوا، بیل اور مٹی وغیرہ کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔"

یہ میلان (دیہات نگاری) نقوی صاحب کی تحریر میں ہمیشہ غالب رہا۔ ان کا مشہور زمانہ ناول "میرا گاؤں" اس کی نہایت خوبصورت مثال ہے۔ "نقطے سے نقطے تک" کے بیشتر افسانے بھی نقوی صاحب کے دیہات نگاری کے اولین میلان کی یاد دلاتے ہیں۔ ان میں گڑ کی ڈلی، نیلے پربت، نقطے سے نقطے تک، اور اپنا گھر، بدلتے ہوئے حالات میں دیہات کی معنی خیز عکاسی کرتے ہیں۔

ناقدین "ادب عالیہ" کو ہیومنزم (انسان دوستی) سے مشروط کرتے ہیں۔ ادب کا لفظ بھی اس خوبی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسے پیش نظر رکھ کر اگر "نقطے سے نقطے تک" کا مطالعہ کیا جائے تو مجموعے کے اگر سارے افسانے نہیں تو کم از کم اللہ معافی، زمزمۂ محبت، اللہ ہو، دارالامان، پہیا اور اپنا گھر ادب عالیہ کی اس شرط پر پورے اترتے ہیں۔

دیباچہ ایک طرح سے کتاب کے مجمل تعارف کا درجہ رکھتا ہے اور بہت کچھ قاری کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ "نقطے سے نقطے تک" پر چند سطور لکھتے ہوئے مجھے ڈاکٹر انور سدید کے چند جملے یاد آتے رہے جو انہوں نے اپنے ایک مضمون میں نقوی صاحب کی افسانہ نگاری پر لکھے ہیں۔ میں دیباچے کو ان جملوں پر ختم کرتا ہوں:

"ایک طلائی تثلیث جو غلام الثقلین نقوی کے افسانوں میں بے حد نمایاں ہے وہ بصیرت، تجربہ اور احساس کی تثلیث ہے۔ بصیرت زندگی کا گہرا مشاہدہ ہے۔ داخلی خواصی بصیرت اور تجربے کا امتزاج ظہور میں لاتی ہے۔ خارجی تعلق داخلی حسیات سے متصادم ہو کر جب فنی اظہار کی راہ پاتے ہیں تو نقوی صاحب کا افسانہ جنم لیتا ہے۔"

سجاد نقوی

دو تین باتیں اور

۱۹۸۶ء میں میرا افسانوی مجموعہ "دھوپ کا سایہ" شائع ہوا تو میں نے اسے آخری مجموعہ قرار دیا حالانکہ اس کے بعد ایک مجموعہ "سرگوشی" کے عنوان سے چھپا۔ اس مجموعے کے آخری افسانے "قلم" میں مَیں نے یہ تاثر دیا کہ گویا اب میں نے افسانہ لکھنے والا قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ یہ افسانہ نومبر ۱۹۸۷ء میں لکھا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۹۱ء تک کوئی افسانہ نہ لکھا جا سکا تاہم "قلم" سے ضرور وابستگی قائم رہی۔ اب اس مجموعے کو میں آخری مجموعہ سمجھ کر شائع کر رہا ہوں۔ اگر اس کے بعد کوئی افسانہ لکھا بھی گیا تو کسی مجموعے کی صورت میں منصہ ٔ شہود پر نہیں آ سکتا۔ اس مجموعے سمیت اب تک میرے افسانوں کے کُل سات مجموعے شائع ہوئے جو ستاسی (۸۷) افسانوں پر مشتمل ہیں۔ تجرباتی دَور کے پانچ سات افسانے جو میں نے کسی مجموعے میں شامل نہیں کئے، اس میں شامل کر بھی لیتا تو سنچری پھر بھی پوری نہ ہوتی۔

زمین گول ہے، چاند گول ہے اور سورج بھی تو یقیناً وقت بھی دائرے میں گھومتا ہے۔ زمین سورج کے گرد گردش کر کے پھر اسی نُقطے پر آ جاتی ہے، جہاں سے چلی تھی۔ اس لئے اس مجموعے کا عنوان "نُقطے سے نُقطے تک" مناسب سمجھا۔ اس مجموعے کے ایک افسانے کا بھی یہی عنوان ہے۔ گویا افسانہ نویس کا "قلم" بھی جس نُقطے سے چلا تھا، اسی پر آ کر رُک گیا۔ اس مجموعے کے آخری افسانے کے عنوان کی معنویّت ملاحظہ ہو۔

۷ اکتوبر ۲۰۰۱ء

غلام الثقلین نقوی

اللہ معافی

عنوان میں جو تھوڑا سسپنس ہے' اسے افسانے کے آغاز ہی میں ختم کرنا بہتر ہو گا۔

اللہ معافی ایک لڑکی کا نام ہے' یہی کوئی نو دس سال کی بچی کہ ہمارے ہاں صفائی کے لئے آتی ہے' کبھی اپنی ماں کے ساتھ اور کبھی اپنی بڑی بہن کے ساتھ کہ جس کا نام شہناز ہے۔

جب اس کی ماں نے پکار کر کہا "اللہ معافی ! ذرا جلدی کام کیا کر' ابھی تک تُو ایک چھوٹے سے کمرے میں بھی جھاڑو بھی نہیں لگا سکی۔" تو میں چونک گیا۔

اس بچی نے جھاڑو دیوار سے ٹکا کر کہا "مجھ سے نہیں ہوتا۔" اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور بُت بن گئی۔

"اللہ معافی ! کیا مصیبت ہے تو تو بات بات پر روٹھ جاتی ہے۔" اس کی ماں بولی اور معا" بعد منت بھرے لہجے میں کہنے لگی۔ "اللہ معافی! تُو بہت اچھی بیٹی ہے۔ بڑا اچھا کام کرتی ہے۔ میں نے تو بس یونہی کہہ دیا۔ لے اب غصہ تھُوک دے اور کام شروع کر۔

وہ کھِرچ کھِرچ پھر جھاڑو لگانے لگی۔

جب وہ کام سے فارغ ہو کر چلی گئیں تو میں نے بیوی سے پوچھا۔ "یہ جمعدارنی اپنی بیٹی کو بار بار اللہ معافی کیوں کہہ رہی تھی؟"

"یہ اس لڑکی کا نام ہے۔"

"واہ! کیسا اچھا نام ہے!" میں نے کہا۔

"یہ صفائی کرنے والی جمعدارنی نہیں، مسلمان ہے۔ خیال رکھئے، کہیں آپ اسے جمعدارنی نہ کہہ دیں۔"

کمال ٹاؤن میں صفائی کرنے والیاں اکثر مسلمان ہیں۔ یہ دیہات سے آتی ہیں۔ مرد ان کے مزدوری کرتے ہیں اور یہ عورتیں سارا دن کام کاج میں لگی رہتی ہیں۔ صبح سے شام تک کئی گھروں میں صفائی کرتی ہیں۔

محمد انور گوالا ہمیں دودھ پہنچاتا ہے، کہتا ہے "ان کے مرد بڑے پوستی ہیں۔ سارا دن گھر میں لیٹے رہتے ہیں۔ مرد کا کام کمائی کر کے بال بچوں کو پالنا ہے، نہ کہ عورت اور بیٹی کی کمائی پر پلنا ہے۔"

میری بیوی کہتی ہے "بڑی ہوس ہے ان لوگوں کو۔ اب اسی سرداراں کے پاس آٹھ گھر ہیں۔ صبح ماں بیٹیاں گھر سے خالی پیٹ نکلتی ہیں۔ کسی کے ہاں ناشتہ کیا، کہیں سے دوپہر کا کھانا کھا لیا، جس گھر میں جائیں گی، وہاں سے کوئی ٹکڑا ضرور کھائیں گی۔ پھر بھی ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔"

"اتنی محنت کی جائے تو پیٹ کیسے بھرا رہ سکتا ہے۔ گھنٹے گھنٹے بعد پیٹ خالی ہو جاتا ہے اور یہ جو تم نے کہا انہیں بڑی ہوس ہے، اس سے مجھے اتفاق نہیں۔ مزدور آدمی ہوس کیا کرے گا۔ ایک گھر سے انہیں ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ملتا ہے۔ ایک گھنٹہ تو ایک گھر میں لگ ہی جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ آٹھ گھر کر لیتی ہوں گی۔ اس طرح بارہ سو روپے ماہوار پیدا کر لیتی ہوں گی اور یہ بھی تو دیکھئے کہ اس کام پر تین ماں بیٹیاں لگی ہوئی ہیں۔" میں نے بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کی بے نیازی کا عالم یہ تھا کہ اس نے میرے لمبے وعظ کا ایک لفظ بھی سننا گوارا نہ کیا تھا۔

کمال ٹاؤن کے معاشرے میں نچلی مڈل کلاس کی اکثریت ہے۔ پانچ اور دس مرلے کے مکان عام ہیں۔ اکثر لوگ ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن کے مقروض ہیں۔ کچھ

نودو لیتیے بھی ہیں تاہم زیادہ لوگ وہی ہیں جو ساری عمر لشٹم پشٹم گزارہ کر کے اپنا آبائی مکان بیچتے ہیں یا پنشن کا پیسہ لے کر یہاں مکان بنا لیتے ہیں۔ کبھی ان کی عورتیں اپنے گھروں میں خود جھاڑو دیا کرتی تھیں اور جعدارنی کوٹھا اُتار کر گھر کا کوڑا کرکٹ بھی اٹھا لے جایا کرتی تھی۔ یہاں فلش سسٹم ہونے کی وجہ سے ''کوٹھا اُتارنے'' کی روایت ختم ہو گئی ہے۔

افسانے میں اتنا لمبا جملہ ٔ معترضہ نہیں آنا چاہئے تھا۔ ایک عرصے سے مضمون لکھ لکھ کر عبارات آرائی کا عادی ہو گیا ہوں۔

آمدم بر سرِ افسانہ:

''بیوی! میں کچھ عرصے سے محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے مزاج میں کچھ کچھ بورژوائیت آ گئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی کہ یہ ''بیوی'' کون ہے کہ جس کے مزاج میں نہ جانے کیا آ گئی ہے؟

میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''بورژوائیت کے معنی آپ نہیں سمجھیں گی۔ اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے مثلاً'' آپ جب سے اس مکان میں آئی ہیں، آپ صفائی کرنے والیوں کے سر پر کھڑی ہو کر احکام دیتی ہیں کہ یہ کام کرو، وہ نہ کرو، یہ کونا کھدار صفائی سے رہ گیا ہے۔ فریج کی چوکی کے نیچے جھاڑو نہیں لگا۔ ڈائننگ ٹیبل کے نیچے کا فرش تو کبھی صاف ہی نہیں ہوا وغیرہ۔ اسے بورژوائیت کہتے ہیں--- آج سے کچھ سال پہلے جب آپ بلال گنج میں کرائے کے مکان میں رہتی تھیں تو دو کمروں کو خود ہی صاف کر لیتی تھیں۔ جعدارنی صرف کوٹھا اُتارتی تھی اور کوڑا کرکٹ باہر گھورے پر پھینک آتی تھیں--- اس وقت آپ پرولتاری تھیں۔''

''آج آپ مجھے عجیب عجیب ناموں سے پکار رہے ہیں۔ کیا یہ اچھے نام ہیں یا بُرے؟''

"اچھائی یا برائی ناموں میں نہیں ہوتی، روّیوں میں ہوتی ہے۔" میں نے محسوس کیا کہ یہ جملہ میں نے نہیں بولا بلکہ آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے کی ترقی پسندی مجھ میں عود کر آئی تھی۔ "میں پوچھ رہا تھا کہ اس لڑکی کا نام اللہ معافی کیوں ہے؟"

"اتنی سی بات کے لئے اتنا ہیر پھیر۔ اصل میں آپ وقت سے کچھ پہلے ہی سترے بہترے ہو گئے ہیں۔ یہ سرداراں کی اوپر تلے کی تیسری بیٹی ہے۔ جب یہ پیدا ہوئی تو کسی بزرگ نے مشورہ دیا کہ اس کا نام اللہ معافی رکھ دو یعنی اللہ معافی دے اور اس کے بعد بیٹا عطا فرمائے۔"

"کیا اس نام کا کچھ فائدہ ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! اس کے بعد اللہ نے اسے بیٹا عطا فرمایا۔" وہ بولی۔

"ماشا اللہ! کیا یہ برکت اب تک قائم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یعنی آپ کا مطلب ہے کوئی اور بیٹا؟ --- نہیں --- اس بیٹے کے بعد پھر بیٹی پیدا ہوئی۔"

"مطلب یہ ہے کہ قدرت ناراض ہو گئی۔" میں نے کہا۔

"کس بات پر؟" اس نے پوچھا۔

"فیملی پلیننگ نہ کرنے پر ---" میں نے پوچھا۔

وہ اس بات کی وضاحت مجھ سے طلب کرنا چاہتی تھی کہ شہناز اور اللہ معافی صفائی کے لئے آ گئیں۔

شہناز نے کہا "اللہ معافی! تم اندر کمروں میں جھاڑو لگاؤ۔ میں باہر کا فرش دُھوتی ہوں۔"

"نہیں!" اللہ معافی نے کہا اور پھسکا مار کر فرش پر بیٹھ گئی۔

"شہناز! اگر ہمارے ہاں کام کرنا ہے تو اپنی ماں کو ساتھ لایا کرو، اللہ معافی سے کام نہیں چلے گا، بیوی کے لہجے میں خاصی تیز فہمائش تھی۔

"بی بی جی! یہ سائیں لوک قسم کی لڑکی ہے۔ اپنی مرضی کی مالک ہے۔ ذرا صبر کریں۔ اپنے آپ کام شروع کر دے گی۔" شہناز نے کہا۔

واقعی کچھ منٹوں بعد اس نے کام شروع کر دیا۔ اس کے کام کرنے کا انداز بھی عجیب تھا۔ ایک کمرے کا کام اُدھورا چھوڑ کر دوسرے میں چلی جاتی۔ اُدھورے کاموں کو اس کی بڑی بہن مکمل کرتی۔ میرے کمرے میں آتی تو میں لکھتے لکھتے اٹھ کھڑا ہوتا اور کہتا "اللہ معافی آ گئی ہے۔ اب مجھے کمرے سے باہر نکل جانا چاہیئے۔"

موٹی موٹی بھیگی بھیگی لیکن سائیں لوکوں والی بے چمک آنکھوں سے مجھے دیکھتی اور پوچھتی "بابا! تم مدرسے میں پڑھتے ہو؟"

"ہاں!"

"پہلی جماعت میں!" وہ پوچھتی۔

"ہاں! میں پہلی جماعت سے آگے نہیں بڑھ سکا۔"

اس پر شہناز قہقہہ لگاتی اور کہتی "باباجی؟ جب ہم گاؤں میں ہوتے تھے تو اللہ معافی کو سکول میں داخل کرایا تھا۔ یہ الف سے آگے نہیں بڑھی تھی۔"

میں نے ہنس کر کہا "اتنا ہی کافی ہے۔"

اور مجھے بابا بلھے شاہؒ یاد آ گئے کہ جنہوں نے فرمایا ہے۔

"علموں بس کریں او یار اکّو الف تینوں درکار"

پھر سلطان باہوؒ یاد آ گئے کہ جنہوں نے "الف اللہ" کو "چنبے دی بُوٹی" کہا تھا۔

پھر پتہ نہیں کہ کیا ہوا کہ "چنبے دی بُوٹی" میرے من میں لگ گئی اور نفی کا اثبات کا پانی ملا تو مُشک مچانے لگی۔ میرا دل ذاکر ہو گیا اور مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص مجھ سے جدا ہو گیا ہے اور وہ "اللہ ہُو" کا ورد کر رہا ہے۔ میں اس کی آواز سن رہا ہوں اور سر دُھن رہا ہوں۔

"بابا!" اللہ معافی بولی۔

اور وہ شخص جو مجھ سے جدا ہو گیا تھا' پھر اپنے قالب میں لوٹ آیا۔

میں نے پوچھا "کمرے سے باہر چلا جاؤں؟"

اس نے سر ہلا کر کہا "ہاں!"

میں نے شہناز سے پوچھا "تم کتنا پڑھی ہو؟"

"پانچ جماعتیں!" وہ بولی "ہمارے گاؤں میں لڑکیوں کے لئے صرف پانچ جماعتوں کا سکول ہی ہے۔"

"تم گاؤں سے شہر میں کیوں آ گئے؟"

"زمینوں میں سیم آ گئی ہے اور بہت سے لوگ گاؤں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔"

"کہاں گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"شہروں میں آ گئے ہیں۔"

"تم گاؤں میں یہی کام کرتے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بابا جی! میرا ابا کھیتوں میں محنت مزدوری کرتا تھا۔ پھر کھیت ہی نہ رہے تو مزدوری کہاں سے ملتی؟"

"تو تم شہر چلے آئے۔" میں نے پوچھا "کیا یہاں تمہارے حالات بہتر ہیں؟"

"یہاں مزدوری مل جاتی ہے۔" شہناز بولی۔

اور بیوی نے مجھے ڈانٹا کہ آپ نے شہناز کو باتوں میں لگا لیا۔

اب ہم عمر کے جس دور میں ہیں' چاہئے تو یہ کہ ہم سنیاس لے لیں' ہم بڑے بیٹے کے پاس رہتے ہیں اور میری بڑی بہو گھر کی انچارج ہے لیکن وہ سکول میں پڑھاتی بھی ہے۔ چنانچہ جب تک وہ گھر میں موجود نہ ہو' میری بیوی گھر کا چارج سنبھال لیتی ہے۔ میں نے قریب قریب سنیاس لے لیا ہے۔ جنگلوں میں نکل جانے کی ہمت نہیں پڑی تاہم میں گھر کے کام کاج سے بہت بچتا ہوں۔ پڑھتا رہتا ہوں یا سوتا رہتا ہوں۔

کبھی کبھار کچھ لکھ بھی لیتا ہوں لیکن بیوی سنیاس لینے کو تیار نہیں اور شاید منو سمرتی میں ناریوں کے لئے "گرہست آشرم" کے بعد کی کوئی منزل ہی نہیں آتی۔ وہ اکثر صاحبِ فراش رہتی ہے اور جب تک مرض بے بس نہ کردے بستر پر پڑے پڑے بھی حکم احکام دیتی رہتی ہے۔ بہو شریف ہے ورنہ دو بھانڈوں کے ٹکرانے کی آواز کبھی تو ضرور آتی۔

"دودھ والا کب سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے اور آپ ہیں کہ اخبار میں منہ دئے بیٹھے ہیں، کچھ سنتے ہی نہیں۔"

"جب سے گھنٹی خراب ہوئی ہے، کچھ کم ہی سنتا ہوں۔"

"ان لڑکیوں سے کام ہی کروا لیا کریں۔"

"بیوی! میں کوئی داروغہء صفائی تو نہیں۔"

"اللہ معافی پھر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی ہے۔ آپ ہی اسے کچھ کہیں۔"

میں اللہ معافی کو پچکارتا ہوں اور کہتا ہوں "اللہ معافی! تم بڑی اچھی لڑکی ہو۔ چلو اٹھو، اپنا کام ختم کرلو۔ تم نے اگلے گھر بھی تو جانا ہے۔"

"اُوں ہُوں!" اس نے سر ہلا کر انکار کیا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔"

میں باورچی خانے میں جا کر کوئی بچا کھچا ٹکڑا تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو بیوی پوچھتی ہے۔ "کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ بس یونہی---"

"کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے، ذرا باہر جا کر دیکھئے، کون ہے؟"

میں اٹھنّی جیب میں ڈال کر باہر جاتا ہوں کہ ضرور کوئی بھک منگا ہوگا لیکن وہ شیخ صاحب نکلتے ہیں کہ مکان کے پاس سے گزر رہے تھے اور خیر خیریت دریافت کرنے

کو رک گئے۔

میں واپس آ کر پھر باورچی خانے میں جاتا ہوں، مجھے ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے مل جاتے ہیں۔ میں اللہ معافی کو پیش کرتا ہوں تو وہ "اُوں ہُوں" کہہ کر انکار میں سر ہلا دیتی ہے۔

"کیویں کھاواں؟" اللہ معافی پوچھتی ہے۔

"بابا جی! یہ سالن مانگتی ہے۔" شہناز نے کہا۔

"سالن تو نہیں ہے۔" میں معذرت آمیز لہجے میں کہتا ہوں۔

"سالن نہیں تو اسے انڈا تل دیجئے۔" بیوی بولتی ہے۔

اس کے لہجے میں جو کاٹ ہے، اس سے میں تلملا جاتا ہوں۔

اگلی صبح بہو سے ملی بھگت کر کے میں دو ٹکڑے ڈبل روٹی کے اور تھوڑی سی آلو اور انڈے کی بھجیا رکھوا لیتا ہوں۔

موقع پا کر اللہ معافی کو پیش کرتا ہوں تو وہ انکار کر دیتی ہے اور میں شرمندہ ہو جاتا ہوں۔

"بابا جی!" شہناز نے ٹکڑے میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا "سائیں لوک ہے بیچاری۔ آج اسے بھوک نہیں ہے۔"

اور ممکن ہے بھوک شہناز کو بھی نہ ہو لیکن وہ جلد جلد منہ چلا کر دونوں ٹکڑے ہڑپ کر جاتی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ سائیں لوک اصل میں ذہنی معذور ہوتے ہیں۔ ان کا آئی کیو اتنا کم درجے کا ہوتا ہے کہ اوسط درجے کی انسانی سوچ ان کی سطح سے بہت اونچی ہوتی ہے۔ لوگ انہیں مجذوب جانتے ہیں اور ولی اللہ مانتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں۔ میں کافی خوش عقیدہ مسلمان ہوں لیکن سائیں لوکوں سے کیا، کسی سے بھی مراد نہیں مانگتا۔ پھر بھی اگر مراد مانگنی ہو، تو انہیں ترجیح دوں گا کیونکہ یہ جھوٹ بولنے پر

قادر نہیں اور سچ ان کے لئے عین فطرت ہے۔

میرے پوتے قنبر کو کاروں کا بہت شوق ہے۔ اس کے پاس ساٹھ ستّر کاریں تو ہوں گی، بڑی بھی اور چھوٹی بھی۔ وہ سکول سے واپس آکر فرش پر لیٹ جاتا ہے اور کسی کار سے کچھ وقت ضرور کھیلتا ہے۔ میں اس کی کاریں سنبھال کر رکھ دیتا ہوں کہ ایک کار بھی گم ہو جائے تو وہ بہت فیل مچاتا ہے۔

ایک دن اللہ معافی کو جھاڑو دیتے ہوئے اِس کی ایک ننھی منّی سی کار مل گئی۔

وہ کار اٹھا کر میرے پاس آئی "بابا!"

"ہوں!" میں نے لکھتے لکھتے سر اٹھا کر پوچھا "کیا ہے؟"

"کھیلوں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے کہا۔

وہ فرش پر بیٹھ کر کار چلانے لگی۔ اِدھر سے اُدھر۔ وہ اتنا خوش تھی کہ اس کی خوشی میرے وجود میں سرایت کر گئی اور اس کا حصہ بن گئی اور مجھے فرش پر اللہ معافی کی جگہ قنبر نظر آنے لگا۔ وہی خوشی، وہی انہماک، وہی معصومیت۔

"اللہ معافی!" شہناز کی آواز میں غصہ تھا۔ "کار باباجی کو دے دو اور اپنا کام ختم کرو۔"

اللہ معافی نے کار میری میز پر رکھ کر کہا "بابا!"

"ہاں!" میں نے کہا۔

دو چار لمحوں تک اپنی بڑی بڑی بے چمک سرخ سرخ اور گدلی گدلی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی جیسے وہ توقع کر رہی ہو کہ میں کار اسے دے دوں گا لیکن میں تو قنبر کی کاروں کا امین تھا، امانت میں خیانت کیسے کرتا۔ بات اصل میں یہ نہیں تھی، میں اسے کار دے بھی دیتا تو کوئی فرق نہ پڑتا لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ آج اللہ معافی کو کار دے دی تو وہ کل کلاں کوئی اور کھلونا بھی مانگ لے گی اور یہ سلسلہ دراز ہو جاتا۔

مسلسل فیاضیوں کے لئے میں حاتم کا دل کہاں سے لاتا۔

شہناز نے کہا "بابا جی! ہم صفائی کرنے والیوں کو گری پڑی سینکڑوں چیزیں ملتی ہیں۔ ہم اٹھا کر میز یا کسی اور جگہ پر رکھ دیتی ہیں۔ یہ بیچاری اللہ لوک ہے، کوئی بات نہیں سمجھتی۔"

"نہیں کوئی بات نہیں بچی ہے۔ اس کا جی بھی چاہتا ہے کھلونوں سے کھیلنے کو۔" میں نے شہناز کو تسلی دی۔

کچھ دنوں بعد کی بات ہے، وہ جھاڑو پکڑے ہوئے میری میز کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

میں نے کہا "تم نے یہاں جھاڑو لگانا ہے۔ لو میں باہر چلا جاتا ہوں۔"

"بابا!" وہ بولی "چھیناں کی گڈی چور لے گیا---"

"چھیناں کی گڈی چور!--- چور لے گیا!--- کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

اس نے مطلب بیان تو کیا لیکن میں سمجھ نہ سکا۔ اتنے میں شہناز آ گئی۔ اس نے کہا "بابا! چھیناں ہماری سب سے چھوٹی بہن ہے۔ اللہ معافی کو وکیلوں کے ہاں سے پلاسٹک کی ایک ٹوٹی پھوٹی گڑیا ملی تھی جسے کوڑے میں پھینکنے کی بجائے یہ اپنی بہن کے لئے لے گئی۔ کل جب ہم گھر میں نہیں تھیں، تو ہماری چوری ہو گئی۔ چور ہمارے برتن لے گیا، کپڑے بھی اور چھیناں کی گڑیا بھی۔"

تفصیل پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک زیرِ تعمیر گھر کے ایک کمرے میں رہتے ہیں، جس کا دروازہ بھی ابھی نہیں لگا اور ایک پردہ سا ڈال کر گزارہ ہو رہا ہے۔ باپ مزدوری کی تلاش میں گیا ہوا تھا، چھوٹا بھائی اور چھیناں باہر ریت کے ڈھیر پر گھروندے بنا رہے تھے کہ کوئی پردہ اٹھا کر گھر کا صفایا کر گیا اور چھیناں کی گڑیا بھی لے گیا۔

"اللہ معافی کو صرف گڑیا کی چوری ہونے کا افسوس ہے۔" شہناز نے کہا "اس

لئے کہ وہ چھیناں کی گڑیا تھی۔"

خون کا رشتہ کتنا گہرا ہوتا ہے' میں نے سوچا۔

میری بیوی نے کہا "یہ لوگ ایسے قصے گھڑتے رہتے ہیں تاکہ چیزیں اکٹھی کر لیں۔"

"نہیں بیوی! اللہ معافی کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔" میں نے کہا۔ میرے لہجے میں جو یقین تھا' اس نے بیوی کو خاموش کر دیا۔

اس دن جب شہناز باہر کے فرش دھو رہی تھی اور اللہ معافی اندر جھاڑو دے رہی تھی' کِھرچ کِھرچ' رُک رُک کر' کبھی دھیان کے ساتھ اور کبھی بے دھیانی کے عالم میں' دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اپنا کام کرتا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ دیکھئے بیوی جی کی طرف سے کب دروازے پر جانے کا حکم ملتا ہے۔ کچھ عرصے سے میرے اندر کا "لڑکا" باغی ہو رہا تھا کہ حکم کی بجاآوری سے بچنے کے لئے حکم کو کان میں مارنے کی بُری عادت کا شکار ہو رہا تھا۔

ایک دو منٹوں بعد بیوی کی آواز آئی "شہناز تمہاری ماسی آئی ہے۔"

اللہ معافی بھی دوڑ کر پھاٹک تک گئی اور کچھ عرصے بعد میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور بُت بن گئی۔

"کیا ہوا اللہ معافی؟" میں نے پوچھا۔

اس کی گدلی گدلی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

وہ بولی "بابا! چھیناں کھڑتج گئی ہے۔"

کسی بچے کے گم ہونے کی خبر سن کر میں اپنے آپ میں کھڑتج جاتا ہوں اور اخبار میں خاص طور پر جب کسی بچی کی گمشدگی کی خبر پڑھتا ہوں تو بے اختیار میرے ہاتھ بارگاہِ الٰہی میں بلند ہو جاتے ہیں اور آلِ محمدؐ کے اُن بچوں کے صدقے میں کہ جو صحرائے کربلا میں گم ہو گئے تھے' دعا مانگتا ہوں کہ بارالہا یہ بچی اپنے والدین کو مل جائے

کہ شکاری اس کی گھات میں ہیں اور--- میں اس سے آگے دعا کے لئے لفظ ذہن میں آئیں بھی تو انہیں دعا میں لانے کی جرات نہیں پاتا---

"باباجی! ہم چلی جائیں؟" شہناز نے پوچھا۔

میری بیوی نے کہا "ضرور--- ضرور--- اللہ کرے تمہاری بہن مل جائے۔"

ان کے جانے کے بعد میں نے بڑے خلوص سے دعا مانگی۔ کبھی کبھار ہی دعا میں اتنا خلوص آتا ہے کہ تن بدن اس میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ اپنے لئے دعا میں خلوص کا آنا فطری عمل ہے لیکن دوسروں کے لئے دعا میں خلوص ایک معجزے سے کم نہیں ہوتا۔ اصل میں یہ دعا بھی کچھ ذاتی سی تھی۔ جب بھی کوئی بچی گم ہو جاتی ہے تو مجھے آج سے دس بارہ سال کی چند ساعتیں یاد آ جاتی ہیں جو میرے لئے چند قیامتیں بن گئی تھیں اور جن کا ایک ایک لمحہ ہزار سال کی طوالت اختیار کر گیا تھا۔ میری ایک اڑھائی سالہ پوتی ان چند ساعتوں کے لئے کھڑتج گئی تھی اور یوں سمجھ لیجئے کہ میں آنکھوں تک پتھر کا بن گیا تھا۔ آنکھیں اس لئے زندہ رہیں کہ میں اس کی راہ تک رہا تھا۔ جب میں نے اسے اپنے محلے کے خادم و محافظ پھل فروش پہلوان کی گود میں دیکھا تو پتھر یک لخت گداختہ ہو گیا اور میں چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔ اس پہلوان کا نام اب بھی مجھے معلوم نہیں، فرشتۂ رحمت کا نام جاننے کی ضرورت بھی کیا ہے!

یہی کیفیت مجھے آج بھی محسوس ہوئی!

اور میں اگلی صبح تک ہر نماز میں اس کی بازیابی کی دعا مانگتا رہا۔ جب شہناز اور اللہ معافی اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوئیں تو میں نے پوچھا "لڑکی مل گئی؟"

"نہیں بابا!" شہناز بولی "مسجد میں اعلان کرایا۔ ابا نہ جانے کہاں کہاں گیا۔ تھانیدار نے کہا ہے، میں بھی کوشش کروں گا۔ ہمارے گھر کے سامنے میدان میں جھولے لگے تھے۔ چھیناں وہاں گئی اور کھو گئی۔"

شہناز کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "بابا! چھیناں کھڑتج گئی۔"

اللہ معافی نے میرے قریب آ کر آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"آؤ! ہم دونوں مل کر اللہ سے دعا مانگتے ہیں۔"

میں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اللہ معافی مجھے بٹ بٹ تکتی رہی۔ شہناز نے جھاڑو اٹھایا اور صفائی شروع کر دی۔

وہ بولی "ماں نے کہا' جاؤ کام کر کے آؤ۔ کوئی کھڑ تیج جائے تو دنیا کے کام تو نہیں رکتے۔"

پھر اللہ معافی نے بھی جھاڑو پکڑ لیا اور کھرچ کھرچ جھاڑو دینے لگی۔ اس دعا نے مجھے نڈھال سا کر دیا۔

تب پھاٹک پر زور زور سے دستک ہوئی۔ بیوی نے پھاٹک تک جائے بغیر کہا "شہناز! دیکھو تو تمہاری ماسی نہ آئی ہو۔"

شہناز دوڑ کر پھاٹک تک گئی۔ دوڑ کر واپس آئی۔

"اللہ معافی! چھیناں مل گئی۔" اس نے رَندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"بابا! چھیناں لبھیج گئی! لبھیج گئی!"

اور دونوں لڑکیاں یہ جا' وہ جا' چھلاوہ بن گئیں۔

بیوی بُڑبڑائی "آج پھر کام ادھورا چھوڑ کر گئی ہیں۔ ان سے جتنا بھی احسان کرو' یہ ناشکری کی ناشکری رہتی ہیں۔"

لیکن ان لمحوں میں میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔ میں تو اس جنگل میں تھا جہاں سینکڑوں مُردار خور منہ پھاڑے' زبانیں لٹکائے ایک شکار کی گھات میں تھے کہ جو اس جنگل میں راستہ بھُول گیا تھا اور میری دعا شکار کو ان کے نرغے سے نکال لائی تھی۔

کیا یہ میری دعا تھی یا اللہ معافی کے دل کا سوز تھا جو کارگر ثابت ہوا؟

وَاللہُ اَعلَمُ بِالصَّوَاب! (مئی ۱۹۹۱ء)

☆ ☆ ☆ ☆

نیلے پربت

آج سے پچاس سال پہلے اُسے اپنے باپ سے ورثے میں ایک جوڑی بیل' ایک راس بھینس' ایک دو ہل' کچھ درانتیاں کھرپے کسیّاں' ایک کچا مکان اور چار بیگھے زمین ملی تھی۔

آج جب وہ بسترِ مرگ پر لیٹا ہوا تھا' گاؤں سے باہر کھیتوں میں اُس کا پکا اور ہوا دار مکان تھا جس کی ایک کھڑکی پربت کی طرف کھلتی تھی۔ چھت سے لگا ہوا پنکھا پُھر پُھر چل رہا تھا۔ جہاں کبھی رہٹ رُوں رُوں کرتا تھا' وہاں اب ٹیوب ویل پھک پھک کر رہا تھا۔ ایک کھیت میں ٹریکٹر چل رہا تھا اور ایک کٹے ہوئے کھیت کے کونے پر ویٹ تھریشر پڑا تھا جو ابھی ابھی منوں گندم بھُوسے سے الگ کر کے فارغ ہوا تھا۔ چار بیگھے زمین پھیل کر ایک مربعے کے سرسبز و شاداب فارم کی شکل پا چکی تھی۔

پر یہ سب کچھ اس کا اپنا نہیں تھا' اُس کے بیٹے کا تھا جو جیٹھ ہاڑ کی دھوپ' پوہ ماگھ کے جاڑے اور رَوکھی سُوکھی روٹی سے بیزار ہو کر گاؤں سے نکل گیا تھا اور جب آٹھ دس سال بعد واپس آیا تو موجودہ ثروت بھی اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

اس قلبِ ماہیئت پر وہ خوش تھا' نہ ناخوش۔ اس تبدیلی کو اُس نے قبول کیا تھا' نہ رد۔ یوں یہ تبدیلی آئی بھی آہستہ آہستہ تھی۔ ایسا نہیں ہوا تھا کہ اچانک اس کا ہاتھ ہل کی ہتھی سے اٹھ گیا ہو اور گورے اور لاکھے سے اس کا رابطہ "آناً فاناً" ٹوٹ گیا ہو لیکن ایک دن ایسا آیا جب تھان پر گورا اور لاکھا موجود نہیں تھے۔ صرف بھُوری بندھی ہوئی تھی۔

تب ایک عجیب سی حسرت اُس کے دل میں سما گئی تھی' ایک خلا سا جسے کوئی آسائش پُر نہ کر سکی تھی۔ وہ مصروف زندگی جس کا وہ عادی تھا اور وہ بندھا ٹکا معمول جو صدیوں سے وراثت میں چلا آ رہا تھا' بدلا تو گویا زمانہ بدل گیا۔ آرام و آسائش کی یہ زندگی بہرحال محنت و مشقت کی اس زندگی سے بہتر تھی جس میں اس کی عمر کا بیشتر حصہ گزر گیا تھا۔

تاہم وہ اس زندگی سے مانوس نہ ہو سکا۔

صبح خیزی کی عادت نہ گئی۔ صاحب فراموش ہونے سے قبل وہ سارے گھر والوں سے پہلے جاگتا تھا۔ صبح صبح وہ سب سے پہلا نغمہ صبحِ صادق کی نقیب چڑیا کی آواز میں سنتا جس کے متعلق وارث شاہ کہتے ہیں:

چڑی چُوکدی نال ٹرے پاندی' پیاں دودھاں وچ مداھنیاں نے

اسے لوگ کلچڑی کہتے۔ اس کی آواز میں خوبصورتی تھی' نہ اس کی شکل میں۔ آواز ایسی جیسے جست کے کسی ٹکڑے پر پتھر سے ٹھوکر لگائی جا رہی ہو۔ پتھر دھات کی مُلی جلی آواز اور رنگ کوئلے کی طرح سیاہ' دُم جسم کی مناسبت سے بہت لمبی اور نوک پر دوشاخہ۔ کسی شاخ پر بیٹھتی تو ہر دم متواتر ہلتی رہتی۔ اس کے رنگ میں کوئل کے رنگ کی چمک تھی' نہ آواز میں گلدُم کی آواز کا رَس لیکن یہ سحر خیز تھی اور یہی صفت اسے دوسری چڑیوں سے ممتاز کرتی۔

"زندگی بھی تو ایک سفر ہے اور کلچڑی ہر روز راہی کو اس سفر کے لئے جگاتی ہے۔" وہ ہل کی ہتھی پر ہاتھ رکھ لیتا اور گویا سفر کا آغاز ہو جاتا۔ اب وہ صرف اس کی "چُوک" سے لطف اٹھاتا۔ پھر وضو کرتا اور جب گاؤں کی طرف سے اذان کی آواز آتی تو نماز پڑھتا۔ اُس وقت تک سارے پرندے بیدار ہو جاتے۔ گرمی ہو یا سردی وہ کھیتوں کی سیر کو ضرور جاتا۔ کھیتوں ہی میں وہ چڑھتے سورج کا نظارہ دیکھتا۔ جب وہ ہل چلایا کرتا تھا تو اَن دنوں سورج کے نکلنے اور ڈُوبنے میں اُسے کوئی خاص بات نظر نہ آتی

تھی۔ بس صبح ہوتی اور شام ہوتی اور عمر گزرتی چلی جاتی۔

جب سے وہ ہَل پنجالی سے فارغ ہوا تھا' اُسے طلوع ہوتے اور غروب ہوتے سورج کا منظر بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ اس سے محظوظ ہوتا اور کبھی کبھار اس میں کھو بھی جاتا۔ شاید اس لئے کہ یہ زندگی کا ایک استعارہ ہے کہ انسان کے اجتماعی لاشعور کا جزِولاینفک بن چکا ہے لیکن اسے اس فلسفے سے آگاہی نہیں تھی۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اُس کا گاؤں پہاڑوں کی تلہٹی میں واقع تھا۔ اگرچہ پہاڑ یہاں سے بہت دُور تھے لیکن سارا دن نظر آتے تھے' کبھی دُھندلے کبھی واضح۔ پہاڑوں کا رنگ نیلا تھا اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر برف بھی تھی اور اس کی سفیدی میں شفق صبح و شام آگ لگا دیتی تھی اور سُرخ کرنوں کے تیر اور نیزے ریشم کے پُھندنے بن کر دل میں آ لگتے تھے۔

یہ پہاڑ ایک نامکمل نعل کی صورت میں مشرقی افق کی ایک چوتھائی پر محیط تھے اور مغرب میں مُڑتے ہی نعل ٹُوٹ جاتی تھی۔ سورج ایک چھوٹی سی پہاڑی کے پیچھے سے طلوع ہوتا تھا۔ یہ پہاڑی سیاہ رنگ کی ایک دیوار کی مانند تھی کہ جس کے اُوپر سے کرنوں کے تیر پھُوٹتے اور جب اُجالا ہوتا تو پہاڑی کا رنگ نیلا ہو جاتا اور مغرب میں ڈُوبتا ہوا سورج درختوں کے مدوّر حاشیے کے پیچھے ایک عرصے تک جھلملاتا رہتا اور ڈُوبتا تو درخت شفق کے رنگ میں ڈُوب جاتے۔

پھر وہ آہستہ آہستہ سیاہ پڑتے اور ہیولے سے بن جاتے اور آخر اندھیرے میں ڈُوب جاتے۔

لیکن اسے زیادہ لذتِ نظارہ شمال کے نیلے پہاڑوں سے ملتی اور ایک حسرت بھی۔ حسرت اس بات کی کہ کاش وہ ایک پکھیرو ہوتا اور نیلے پہاڑوں کی بلندیوں کو طے کرتا ہوا برف پوش چوٹی کو چھو سکتا اور دیکھتا کہ اُس سے پرے کیا ہے۔

جب کبھی یہ آرزو اس کے دل میں آتی تو اسے لگتا کہ یہ تو صدیوں سے اس گھر میں موجود تھی' پنجرے میں بند ایک پرندے کی طرح --- بچپن ہی سے وہ اس

آرزو کو اپنا قیدی بنا چکا تھا یا اس آرزو نے اُسے اسیر کر لیا تھا۔۔۔

اُس کے گاؤں میں پرائمری سکول تھا اور اس نے چار جماعتیں یہیں پڑھی تھیں۔ یہ سکول گاؤں کے شمال میں تھا اور سکول کے دونوں کمروں کی کھڑکیاں پربت کی طرف کھلتی تھیں اور وہ ٹاٹ پر پربت کی طرف منہ کر کے بیٹھتے اور جب تک سکول لگا رہتا نیلے پہاڑ کبھی دُھندلے اور کبھی صاف نظر آتے رہتے۔

اُس کے ایک ہندو ماسٹر نے بتایا تھا کہ وہ چوٹی جہاں برف نظر آتی ہے وہاں دیوی کا ایک مندر ہے اور اُسی کے نام پر اُس کا نام دیوی پربت ہے۔ مندر میں دیوی کا بت ہے، دُور دُور سے یاتری آتے ہیں اور دیوی کے درشن کرتے ہیں۔

"آپ بھی کبھی دیوی کے درشن کو گئے تھے؟" اس نے پوچھا تھا۔

"ہاں! دیوی نے ایک بار کرپا کی تھی اور مجھے اپنے مندر میں بلایا تھا۔" ماسٹر جی نے جواب دیا۔

اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "دیوی نے بلایا تھا؟"

"جب کوئی مسلمان حج کے لئے مکے مدینے جاتا ہے، تو وہ اپنے آپ تو نہیں جاتا، اللہ کریم اسے بلاتے ہیں۔" ماسٹر جی بولے۔

ماسٹر جی کا یہ فلسفہ اُسے کچھ مشکل محسوس ہوا تو اُس نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ "ماسٹر جی! آپ یہاں سے پہلے سیدپور گئے تھے؟ پھر وہاں سے جموں والی توی پار کی اور تب دریائے چناب عبور کیا؟ اور بجوات کے علاقے میں سے گزر کر آپ نے پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا؟"

"نہیں تو پگلے! پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچنے کے راستے اتنے سیدھے نہیں ہوتے۔ ہم انسان ہیں کوئی پنکھ پکھیرو تو نہیں کہ اُڑتے اُڑتے سیدھے چوٹی پر جا پہنچے۔۔۔ میں پہلے شہر گیا۔ وہاں سے نندہ بس سروس کی ایک لاری پر سوار ہوا اور جموں پہنچا۔ وہاں سے آگے ایک سڑک دیوی کے پربت کی طرف جاتی ہے۔ اس پر

پیدل سفر کیا تھا۔ راستے میں دو پڑاؤ بھی کئے تھے۔ دیوی کے مندر تک پہنچتے پہنچتے جوتیوں کے تلوے گھس گئے تھے اور پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔"

ماسٹر جی خاموش ہوئے تو اس کا جی اُداس سا ہو گیا اور مایوس بھی--- سکول کی مغربی دیوار سے لگ کر وہ کچی سڑک سامنے موجود تھی جو شہر سے آتی تھی اور سیدپور جاتی تھی اور اس سے آگے توّیاں اور ندی نالے اور دریائے چناب تھا اور بجوات کا سرسبز علاقہ تھا لیکن وہ اس سڑک کی ہمراہی میں نیلے پربت کی چوٹی پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔

"دیکھو بچّو! منزل تک پہنچنے کے لئے کوئی راستہ سیدھا اور سپاٹ نہیں ہوتا۔ ہر راستے میں موڑ ہوتے ہیں اور بہت سے پیچ و خم۔ بیسیوں رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ ندی نالے، جنگل اور کانٹے اور گلِ مراد تو چوٹی پر پہنچ کر ملتا ہے۔"

چوتھی جماعت میں جو منشی جی اسے پڑھایا کرتے تھے، وہ کبھی کبھار اس قسم کی مشکل باتیں کرتے تھے--- کچھ زیادہ ہی پڑھے لکھے تھے--- گلِ مراد کے معنی نہ اسے اُس وقت آتے تھے، نہ اب--- البتہ پہاڑ کی چوٹی ہمیشہ اس کے خوابوں میں رچی بسی رہی--- ممکن ہے کہ اس چوٹی پر "گلِ مراد" بھی ہو--- گلِ بکاؤلی کا نام تو اس نے سنا تھا۔ وہ کسی جھیل کے عین درمیان میں ایک پری بکاؤلی کے محل میں محفوظ تھا--- یہ کہانی عام مشہور تھی اور میاں محمد بخشؒ نے جو سیف الملوک لکھی ہے، اس کا ہر بیت جھیل سیف الملوک تک لے جاتا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ جھیل بھی ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے--- تو گلِ بکاؤلی اور گلِ مراد ایک ہی چیز ہیں کہ پہاڑ کی چوٹی پر ملتے ہیں--- کبھی کبھار اس کے پاؤں زمین سے اکھڑ جاتے ہیں اور بندہ آسمان پر اُڑنے لگتا ہے---

جب اس نے چوتھی کا امتحان پاس کیا تو منشی جی نے کہا "محمد عالم! چلو میں تمہیں چھاؤنی کے سکول میں داخل کرا آؤں۔" چھاؤنی گاؤں سے دکھن کی طرف تھی۔ چند

قدموں کے فاصلے پر۔ صرف نالہ پلکھو کو عبور کرنا پڑتا تھا جو برسات کے دنوں کے علاوہ سارا سال سُوکھا رہتا تھا یا اس میں ٹخنوں تک پانی بہتا تھا--- اور چھاؤنی کی پہلی پکی سڑک صرف آدھ میل کے فاصلے پر تھی' صاف ستھری سڑک کہ جس کے دو رویہ سفیدے کے درخت تھے جیسے سنتری کھڑے ہوں۔ سیدپور سے آنے والی کچّی سڑک یہاں آ کر پکّی ہو جاتی تھی۔ یہ سڑک کچّی ضرور تھی لیکن اس کے دونوں کناروں پر شیشم کے گھنی چھاؤں والے درخت تھے اور برسات میں سڑک پر سبز گھاس کا فرش بچھ جاتا تھا اور بہار کے موسم میں بھی۔ تقریباً" سارا سال گھاس سبز رہتی۔ جیٹھ ہاڑ میں سُوکھ جاتی لیکن جونہی بارش کا پہلا چھینٹا پڑتا تروتازہ ہو جاتی۔ اُس زمانے میں پلکھو پر پُل تھا' نہ سڑک پکّی تھی۔ جونہی سڑک پر اینٹیں لگیں' اس کے دو رویہ درخت اور گھاس غائب ہو گئے۔ اصل میں بات یہ ہوئی کہ گھاس کو اینٹوں نے دبا لیا اور شیشم کے درختوں کو ڈسٹرکٹ بورڈ کے ایک چیرمین بلکہ چورمین کی ہوّس کھا گئی--- شیشم کو بھی اور اُس کے سائے کو بھی--- اور شیشم کے جو چند نوخیز پودے بچے' انہیں گاؤں کے چھوٹے چور کھا گئے--- اب سڑک پکّی ہے اور پلکھو پر پُل بھی ہے۔ پر وہ ہریالی کہاں گئی جو زمین کا ننگ ڈھانپتی تھی اور تھکی تھکی آنکھوں پر ملائی کا پھاہا رکھتی تھی اور وہ سائے کہاں گئے جو نیند بن کر آنکھوں میں اُتر جاتے تھے---

پھر ہوّس کی آری نے پلکھو کے دونوں کناروں کو بھی لُنج مُنج کر دیا۔

وہ پلکھو پار کر کے چھاؤنی میں داخل نہ ہو سکا۔

اُس کے باپ نے کہا "محمد عالم! جن کے پاس چار بیگھے زمین ہو' وہ پلکھو سے اِدھر ہی رہتے ہیں۔"

تب اُس نے اپنی نظر دیوی کے پربت پر جما دی۔ کیا پتا اُس پہاڑی کے اوپر بھی کوئی جھیل ہو کہ جہاں کوئی پری گلِ مراد کی حفاظت کر رہی ہو۔ اگرچہ ہل اور درانتی سے اس کا رابطہ کم سنی ہی سے تھا تاہم جب پڑھائی چُھٹی تو ہل اور درانتی نے اُسے

دھرتی کا قیدی بنا دیا۔ پاؤں دھرتی سے چمٹے رہے لیکن نظر آسمان کی طرف رہی کیونکہ وہ پربت کا آدمی تھا۔

اور دکھن میں چھاؤنی سے آگے شہر تھا' بڑا آباد شہر کہ جس کے بازاروں میں دُنیا جہان کا مال تھا۔ اُس کے گاؤں کے کھتری برج لال کی دکان میں بھی الم غلم بہت سامان بھرا ہوا تھا' ضرورت کی ہر چیز مل جاتی تھی۔ جب کسان کا غلہ ختم ہو جاتا تو وہی غلہ برج لال کی دکان میں موجود ہوتا لیکن اسے خریدنے کے لئے اُس کے پاس پیسہ نہ ہوتا۔ جب تک نئی فصل نہ آتی' وہ برج لال سے اُدھار غلّہ لیتا اور پھر نئی فصل پر اُسے ڈیڑھ گنا ادا کرنا پڑتا۔ عجیب چکّر تھا!

ہونا یہ چاہئے تھا کہ اُس کی نظر دکھن کی طرف ہوتی۔ وہ چھاؤنی سے شہر پہنچتا۔ وہاں سے ریل گاڑی یا لاری پر اس سے آگے بڑے بڑے شہروں میں جاتا۔ کیا پتہ وہ برج لال کے ڈیڑھ گنا لالچ کے پنجے سے آزادی حاصل کر لیتا لیکن جن کی نظر پربت پر ہو' وہ ہمیشہ برج لال کے پاس گروی رہتے ہیں اور برج لال کے جانے کے بعد کسی لال دین کے چُنگل میں پھنس جاتے ہیں۔

اُس کے بیٹے محمد فاضل نے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے ہمیشہ پربت کی طرف پُشت رکھی اور دکھن کی طرف منہ--- پھر وہ چھاؤنی سے شہر پہنچا--- اس شہر سے اور بڑے شہر میں--- پھر اس سے بھی بڑے شہر میں اور وہاں سے وہ سمندر کی لہروں پر سوار ہوا اور اُن ملکوں میں پہنچا جن کی ریت غلے کی بجائے دولت پیدا کرتی ہے۔ بڑی زبردست مشقت کے لمبے دنوں اور راتوں کی یاد لے کر وہ گاؤں واپس آیا تو اسی ریت میں سے ڈھیروں دولت رول کر لایا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کی ماں جدائی کے ان لمبے سالوں کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔

لیکن اب کے کھیت آباد ہیں۔ اُن کی مینڈھوں پر پاپلر کے راست قد چھریرے پودوں کا سایہ ہے--- پاپلر کا سایہ بہت مختصر ہوتا ہے۔ وہ شیشم' برنے' سرس' بکائن'

نیم‘ پیپل یا بڑ والی بات کہاں کہ سائے کے ٹھنڈے شامیانے تلے ایک دُنیا آباد ہو جائے۔۔۔ جب رہٹ چلتا تھا تو اس پر ایک سرس‘ ایک بڑنے اور ایک نیم کا سایہ تھا۔ ذرا فاصلے پر ایک جامن بھی تھا اور ایک کاٹھے آم کا درخت بھی۔ گرمیوں کی دوپہریں ان کے نیچے بسر ہوتیں۔ دوپہریں کیا تھیں‘ موج میلہ تھیں۔ کنویں پر اس کے بہت سے شریک تھے۔ دوپہر کو میلہ لگ جاتا۔ بڑی رونق ہوتی۔ جھلنگا سی چارپائیاں بچھی ہوئیں یا پرال اور پھٹی پرانی چٹائیاں کہ جن پر لیٹ کر دوپہر گزار لیتے۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں۔ چغلی بخیلی کا دور چلتا۔ کبھی کبھی دوپہر کی لُو لہو کو گرم بھی کر دیتی اور گالی گلوچ بھی ہو جاتی لیکن ڈانگ سوٹے کی نوبت نہ آتی۔ برسات میں جامن رستے تو درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے ڈر لگتا کہ ابھی کوئی پکا ہوا جامن سر پر گر کر پھٹ جائے گا۔ آم میں ٹپکا لگتا تو سبھی مل کر کھاتے۔

پھر اس کا بیٹا جو دولت کما کر لایا‘ وہ سارے سائے‘ سارے رس بھرے جامن‘ زرد زرد کاٹھے آم کھا گئی اور ان کے ساتھ رشتوں ناتوں کو بھی۔ بیگھہ دو بیگھہ کی ملکیتیں بھی کیا ہوتی ہیں۔ دولت کا جن انہیں ایک ایک کر کے ہڑپ کر گیا۔۔۔ آہستہ آہستہ کنویں کی منڈی کو ڈنڈا لگ گیا۔ ٹیوب ویل کا پانی کتنا ٹھنڈا ہوتا ہے لیکن اس کی دوپہر کتنی سُونی اور سنسان ہوتی ہے۔ اصل میں سایہ بہت غریب پرور ہوتا ہے‘ سائے کو سر سے ہٹا دو تو دُھوپ اور لُو ہی باقی رہ جاتی ہے۔

پاپلر کا پودا دیکھنے میں اچھا لگتا ہے‘ سیدھے قد کا چھریرا سا گبھرو‘ چھیلا اور بانکا پر سایہ بہت خسیس۔ اس کے بیٹے نے جب بڑنے‘ سرس‘ آم‘ جامن اور نیم کے درخت کاٹے تو اس نے کہا تھا ”محمد فاضل! یہ درخت جو تُو نے کٹوا دیئے ہیں‘ یہ تو جوگی اور درویش تھے۔ دادا پڑدادا کے زمانے سے ہمیں سایہ اور پھل دے رہے تھے اور ان کا ہاتھ ہمارے سر پر تھا۔ میں نے زندگی کی دوپہریں ان کے سائے میں گزاریں اور انہوں نے مجھے تسلی دی‘ چپکے چپکے دعائیں پڑھ کر مجھ پر دم کیں اور میرے دُکھ درد دُور

ہو گئے --- اور اب تو میں بے آسرا اور اکیلا ہو کر رہ گیا ہوں۔"

"میں یہاں پاپلر لگاؤں گا۔ دو تین سالوں میں چہل پہل ہو جائے گی ابا!" محمد فاضل بولا۔

"لیکن جب تک وہ جوگی اور درویش کی عمر کو پہنچیں گے، میری گرم دوپہریں کہاں گزریں گی؟"

"ابا! پاپلر سائے کے لئے نہیں لگتا، یہ نفع کے لئے لگتا ہے۔ وہ زمانے گئے جب دادا ایک درخت لگاتا تھا اور پوتے اس کا پھل کھاتے تھے۔ پاپلر پھل نہیں دیتا، نوٹ دیتا ہے۔" محمد فاضل نے کہا۔

"پر میری گرم دوپہروں کا کیا بنے گا فاضل؟"

"وہ کمرے میں پنکھے کے نیچے گزریں گی۔" اس نے کہا تھا۔

اور یہ بہت گرم دن تھا۔ وہ ایک عرصے سے صاحب فراش تھا۔ کمرہ گرم تھا، پنکھا چل رہا تھا لیکن اس کی ہوا میں خنکی نہیں تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اسے ہلکا ہلکا بخار تھا اور اس کی تپش اندر ہی اندر سینے کو جلا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے جو دوائیاں دی تھیں وہ اور بھی زیادہ گرم تھیں۔ کھڑکی کھلی تھی اور گرم چلچلاتی دھوپ کی گرد آلود فضا میں پہاڑوں کی نیلاہٹ بہت دُھندلا گئی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کی آنکھ کا قصور بھی ہو۔ نظر بھی تو کمزور ہو گئی تھی۔ کبھی اس کی آنکھ اُڑتے پرندے کے پَر گِن لیتی تھی اور اب وہ کوے اور کوئل میں پہچان نہیں کر سکتی تھی۔ جب آم اور جامن کے درخت سلامت تھے تو کوئل بھی گایا کرتی تھی۔

اب تو برسات میں کہیں بہت دُور سے اس کی آواز آتی ہے۔

پھر دل میں کئی بھُولی بسری خواہشیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اور سب سے بڑی خواہش تو اس نیلے پربت تک پرواز کی تھی جس کی چوٹی پر صبح و شام برف کو آگ لگ جاتی ہے اور یہ خواہش پوری نہ ہو سکی --- محمد فاضل نے پوچھا "ابا! تمہارے دل میں

کوئی خواہش ہو تو کہو۔ میں اب اس قابل ہوں کہ تمہاری بڑی سے بڑی خواہش پوری کر سکوں۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے کھلی کھڑکی سے نظر آنے والے دُھند۔لے نیلے پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا اور مسکرا کر کہا "کیا مجھے وہاں لے چلو گے؟"

"کہاں ؟" محمد فاضل نے حیران ہو کر پوچھا۔

"دیوی کے پربت پر--- جس کی چوٹی پر برف پڑتی ہے--- تم نے بھی دیکھی ہو گی؟" وہ بولا۔

نہیں تو---" محمد فاضل نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے--- تمہارا رُخ دکھن کی طرف رہا--- اور میں ساری حیاتی پربت کی طرف دیکھتا رہا--- جو تم نے دیکھا' اُسے میں نے نہ دیکھا اور جو میں نے دیکھا اُسے تم نے نہ دیکھا"۔ وہ بولا اور نقاہت نے اس کی آواز کو اتنا ضعیف کر دیا کہ وہ سرگوشی میں بدل گئی۔ محمد فاضل کو اس کی باتیں معمہ معلوم ہوئیں۔ وہ دیر تک سوچتا رہا کہ ابا کی باتوں کا مطلب کیا ہے؟ اچانک کھلی کھڑکی سے چلچلاتی دھوپ نے اندر جھانکا اور پنکھے نے گرم لُو کا ایک بھرپور سانس اس کے منہ پر پھینکا تو اس کے ذہن میں ایک روشنی سی ہوئی۔

"میں سمجھا۔ تم پہاڑ پر جانا چاہتے ہو ابا! یہ تم نے مجھ سے پہلے کیوں نہ کہا۔ میں نے سنا ہے کہ مری کے قریب ایک ہسپتال ہے اور تمہارے جیسے مریضوں کا علاج وہاں ہوتا ہے۔ میں آج ہی شہر جا کر پتا لگاتا ہوں۔"

شہر میں وہ اس ڈاکٹر سے ملا جو اس کے باپ کا علاج کر رہا تھا۔ اس نے اپنے قیافے کا ذکر کیا تو ڈاکٹر بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا "چوہدری محمد فاضل! میں تمہیں رقعہ لکھ دوں گا۔ میری سفارش سے تمہارے باپ کو ساملی سینی ٹوریم میں جگہ ضرور مل جائے گی۔ اگر بابا تین مہینے گرمیوں کے وہاں گزار آئے تو اس کے بچنے کی بہت امید ہے۔"

"وہاں کتنا خرچ آئے گا؟" اُس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

ڈاکٹر نے رف سا تخمینہ لگا کر رقم بتلائی تو محمد فاضل کا چہرہ اُتر گیا--- اتنی رقم!--- اُس نے سوچا--- صرف تین مہینے کا قیام--- کیا ابا کو صحت حاصل ہو جائے گی--- اس کا کیا یقین--- یوں بھی ابا اپنی عمر پوری کر چکا ہے--- اتنی رقم اس کے پاس موجود تو ہے بلکہ دوگنی تگنی لیکن کنویں کے شراکت دار کے اس کھیت کا کیا بنے گا جسے وہ بڑی مشکل سے بیچنے پر آمادہ ہوا ہے اور جس کے بغیر اس کا فارم مکمل نہیں ہوتا اور وہ بلاشرکتِ غیرے کنویں کی پوری زمین کا مالک نہیں بن سکتا--- میں اپنے اکلوتے بیٹے محمد اقبال کو ایک مکمل فارم وراثت میں دینا چاہتا ہوں---

میں اُسی کمرے میں ابا کو کُولر لگوا دوں گا تاکہ اس کی زندگی کے آخری دن آرام و سکون سے گزریں--- اس خیال سے اس کا ضمیر کچھ کچھ مطمئن سا ہو گیا اگرچہ ایک کانٹا سا پھر بھی چُبھتا رہا---

ابھی وہ شہر میں ٹریکٹر کے لئے کچھ نئے پُرزے خرید رہا تھا کہ پہلے ہلکی سی اندھیری آئی، پھر بادل چھائے اور موسم میں خنکی پیدا ہو گئی۔

دکاندار نے کہا "چوہدری! جب بھی تم شہر آتے ہو، ٹریکٹر کے لئے کوئی نہ کوئی نیا پُرزہ ضرور خریدتے ہو۔"

"مستری جی! میری کوشش ہے کہ جہاں تک ہو سکے ٹریکٹر جوان رہے۔ نئے پُرزوں سے اسے نئی زندگی مل جاتی ہے۔"

"لیکن کب تک چوہدری؟ بڑھاپا آخر بڑھاپا ہوتا ہے۔"

یکایک اُسے کانٹے کی چبھن محسوس ہوئی۔ اُس نے پوچھا "مستری جی! کچھ معلوم ہے وہ کمرہ ٹھنڈا کرنے والا کُولر کہاں سے ملے گا؟"

مستری نے اسے دکان کا پتا دیا۔ پھر پوچھا "چوہدری! کُولر کس کے لئے لو گے؟--- اپنے لئے؟--- یاد رکھو اگر مستری اور کسان کُولروں کے عادی ہو گئے تو

چلچلاتی دھوپ کا مقابلہ کون کرے گا؟"

"نہیں مستری! یہ کولر اپنے لئے نہیں ابا کے لئے خرید رہا ہوں۔"

"شاباش چوہدری! خدا ہر بیٹے کو تیرے جیسا بنائے!"

عین اس لمحے ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا آیا کہ جس میں ننھی ننھی بوندوں کی نمی بھی تھی۔ وہ اس چوراہے میں رُک گیا جہاں ایک طرف ٹانگوں کا اڈا تھا اور دوسری طرف کے بازار میں کولروں کی دکان تھی۔ بوندوں میں کچھ تیزی آئی تو اس نے ایک دکان کے چھجے تلے پناہ لے لی۔ پٹاک پٹاک بڑے بڑے چھینٹے پڑنے لگے۔ تپتی سڑک پر قرص سے بننے اور مٹنے لگے اور گرم گرم باس اُٹھنے لگی۔ گاؤں میں یہی چھینٹے پڑتے تو مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھتی۔ تب بادل پھٹ پڑا اور موسلادھار بارش ہونے لگی۔ بازاروں میں گھٹنے گھٹنے پانی بہنے لگا۔

"کھیتوں میں تو جل تھل ہو گیا ہو گا۔" اس نے سوچا۔ "واہ وا! برسات شروع ہو گئی! یہ تو ہاڑ کا پھل چھلا ہے۔" جب بادل تھما تو اُس کے پاؤں خود بخود اڈے کی طرف بڑھ گئے۔ "برسات میں کولر کی بھلا کیا ضرورت ہے، حبس پیدا کرتا ہے، پنکھا کافی رہے گا۔ ہوا میں نمی ہو تو پنکھے کی ہوا ٹھنڈی لگتی ہے۔" "تانگے میں بیٹھے ہوئے یہی سوچ کر اس کے دل و دماغ پر حاوی رہی حتی کہ پلکھو کا پل آ گیا۔

گاؤں کی ہر چیز اسے دھلی دھلی نظر آئی۔ پیاس کے مارے کھیتوں نے جی بھر کر پانی پی لیا تھا۔ شٹالے اور برسیم کے کھیتوں کی سبزی نکھر آئی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور فضا میں خنکی تھی ورنہ زمین بھڑاس نکالتی تو روئیں روئیں سے پسینہ پھوٹ بہتا۔

اس کی نگاہ چونکہ پربت کی طرف نہیں اٹھتی تھی، اس لئے وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ نیلم کی دیواریں ڈھل کر گاؤں سے اور قریب آ گئی ہیں اور وہ پہاڑ جس پر کسی دیوی کا مندر تھا، اس کی چوٹی پر صدیوں سے جمی برف کی سفیدی بھی ڈھل سی گئی تھی اور اس

سے اُوپر آسمان کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ وہ اپنے فارم کی سیر کرتا ہوا گھر پہنچا تو بہت خوش تھا اور ضمیر میں جو کانٹا چُبھا ہوا تھا' اب اُس کی ذرہ بھر خلش باقی نہیں رہی تھی۔

اُس نے بیوی سے پوچھا "ابا کا کیا حال ہے؟"

"بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ابھی ابھی محمد اقبال اُن کے کمرے میں گیا تھا تو وہ پربت کی طرف کروٹ بدل کر آرام کر رہے تھے۔"

"میں اُن کا آرام خراب نہیں کرنا چاہتا۔" وہ بولا۔

اُس نے اچھا کیا کہ پربت کی طرف دیکھنے والے کے آرام میں مخل نہ ہوا کیونکہ بچپن ہی سے جس آرزو کو اُس نے قیدی بنا لیا تھا یا جس آرزو نے اُسے اسیر کر لیا تھا وہ قید سے چھُٹ کر' اُسے بھی قید سے آزاد کر گئی تھی--- دُھلے دُھلے نیلے آسمان کے نیچے وہ ایک سبک پرواز پرندے کی طرف پرواز کر رہی تھی--- وہ کئی ندی نالوں' توِیوں اور ٹھنڈے یخ دریائے چناب کے اُوپر سے اُڑ کر پربت کے دامن میں پہنچی اور پھر چوٹی کی طرف مائلِ پرواز ہو گئی اور نیلے پہاڑوں کی بلندیوں کو طے کرنے لگی اور برف پوش چوٹی کو چھُو کر نیچے کی سرسبز وادی میں اُترنے لگی جہاں دیو ہیکل درخت آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور قدم قدم پر چشمے اُبل رہے تھے اور چھوٹی چھوٹی ندیاں رواں دواں تھیں۔ کہیں خشک سائے تھے اور کہیں نیم گرم دھوپ کی سفید چادریں بچھی تھیں اور ایک نیلی جھیل تھی کہ جس کے کنارے سرو کے درختوں کا حاشیہ تھا اور ان میں چھپی سون چڑیاں اس کے استقبال میں نغمہ خواں ہو گئی تھیں--- کیا ایک اور سیف الملوک نے منزل پر پہنچ کر گلِ مراد پا لیا تھا؟--- کون جانے؟ کیونکہ آہستہ آہستہ بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے جھانکنے والا خواب اُس کے سوا کوئی بھی نہ دیکھ سکا تھا!

(جون ۱۹۹۱ء)

☆ ☆ ☆ ☆

زمزمۂ محبّت

ایک کچی کوٹھڑی، ایک چھپر، سامنے کھلا میدان--- چار دیواری ندارد البتہ دریک اور بکائن کا حاشیہ کہ جس سے میدان کی حد بندی ہوتی تھی۔ گراؤنڈ کے ایک کونے پر شیشم کا سایہ دار درخت۔ دوسرے کونے میں ایک ننھی سی پھلواری جو غفلت اور لاپروائی کی نذر ہو چکی تھی۔ کچی کوٹھڑی میں چند بوسیدہ سے ٹاٹ، ایک چوبی صندوق اور ایک عدد کرُسی کہ جس کی سیٹ کبھی بید کی ہو گی لیکن اب گاؤں کے ترکھان نے اس میں ایک کھردرا سا پھٹا فِٹ کر دیا تھا۔

یہ تھی اس سکول کی کل کائنات۔

نوجوان استاد کچھ مایوس سا ہو گیا۔

رات اس نے نمبردار کی بیٹھک میں گزاری تھی۔ صبح سویرے اسکول آیا تو اس منظر نے اسے اُداس کر دیا تھا۔ نہ جانے کیوں؟

حالانکہ جس پرائمری سکول میں اس نے تعلیم پائی تھی، وہ اس سے بھی گیا گزرا تھا۔

نارمل سکول میں اس نے جو کچھ پڑھا تھا، وہ ابھی تک اس کے ذہن میں تازہ تھا۔ اس نے تخیل کی دنیا میں جس مدرسے کا ہیولے تخلیق کیا تھا، وہ حقیقت کا کھنڈر نکلا تو مایوسی لازمی تھی۔

سکول بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

البتہ درختوں کی شاخوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ پھلواری کے پھولوں پر شبنم

کی بوندیں لرز رہی تھیں۔ گھاس بھیگی بھیگی اور سرسبز تھی۔ نرم نرم دھوپ آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ اس منظر میں قلبی کشادگی اور روحانی بہجت کے لئے اچھا خاصا سامان موجود تھا' لیکن اس کی طبیعت بُجھی بُجھی رہی۔ اس نے اندر سے کُرسی نکالی' جھاڑ پُھونک کر میدان میں بچھائی اور سر جھکا کر اس پر بیٹھ گیا۔

تب ہلکے ہلکے قدموں کی چاپ اسے سنائی دی۔

چند ڈری سہمی آنکھیں اسے عجیب سی نظروں سے تاک رہی تھیں۔ کوئی بھی آنکھ اس کی آنکھ سے مِلنے کی جرات نہیں کر رہی تھی۔ اس نے کُرسی سے اٹھ کر کہا "بہت دیر سے آتے ہو تم؟" اس کی آواز فطری طور پر بڑی پاٹ دار تھی اور یہ فقرہ کچھ ایسے انداز میں اس کے منہ سے نکلا کہ ننھے مُنے سایے سہم کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئے' ڈری سہمی نگاہیں سکڑ سمٹ کر سات سمندر پار چلی گئیں۔ اس نے کہا "میرا منہ کیا دیکھتے ہو۔ کمرے اور چھپر کو صاف کرو۔ ٹاٹ بچھاؤ تو سکول کا کام شروع ہو۔"

احکام صادر فرما کر وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے سر جھکا لیا۔ آج اس کی ملازمت کا پہلا دن تھا۔ سابق مدرس نے بیماری کی لمبی چھٹی لے لی تھی۔ سکول کی حالت ابتر تھی۔ یہ سکول نیا نیا کُھلا تھا۔ اور ابھی اس میں صرف دو جماعتیں جاری تھیں۔ یہ سکول تہذیب اور تہذیب کی گہما گہمی سے تھا بھی بہت دور۔

کہاں گکھڑ منڈی کا نارمل سکول اور کہاں "گھٹّے پھکنی" کا لوئر پرائمری سکول۔ اس عجیب سے نام پر اسے بلا ارادہ ہنسی آ گئی۔ گاؤں بھی کتنا لُٹا پُٹا سا تھا۔ ہر طرف دھول اڑ رہی تھی۔ یوں لگا جیسے تختۂ زمین پر اسے کہیں جگہ نہ مل سکی ہو اور فطرت کے صناع نے اسے بے کار سمجھ کر اتنی دُور پھینک دیا ہو۔

نزدیک کا قصبہ جہاں لاریوں کا اڈا تھا' یہاں سے کالے کوسوں کے فاصلے پر تھا۔ پیدل سفر کرتے ہوئے ٹانگیں بھی جواب دے گئی تھیں اور کلر اُٹھی دُھول پھانک پھانک کر حلق تک اس کا منہ کڑوا ہو گیا تھا۔ رستے میں کہیں کوئی ایسا کنواں بھی نظر نہ آیا

جہاں کوئی پنہاری "بوکے" سے پانی اس کی اوک میں ڈالتی اور پانی پینے میں کسی پنجابی فلم کا مزہ آتا۔ شام کے جھٹپٹے میں جب وہ گاؤں میں پہنچا تو بے شمار مریل مریل سے کتوں نے بھونک کر اس کا استقبال کیا تھا۔ نمبردار کی ڈیوڑھی میں لالٹین کی روشنی تھی اور مٹی کے تیل کی بُو رچی ہوئی تھی۔ جن برتنوں میں اس نے کھانا کھایا تھا، ان میں گاڑھی لسی کی باس کا رچاؤ تھا، ہر لحہ کھٹا ڈکار محسوس ہوتا تھا۔

نمبردار نے کہا تھا "منشی! ہم دنیا جہان سے اتنے دُور ہیں کہ نہ یہاں بجلی پہنچی ہے نہ تعلیم۔ زمین کلر اٹھی ہے اور نہر کا پانی ہمیں بہت کم ملتا ہے، کیونکہ ہم راجباہ کی ٹیل پر واقع ہیں۔ یہ مدرسہ بھی یہاں خود بخود کھل گیا ہے، ہم نے کوئی کوشش نہیں کی تھی؟"

کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"ہمارے لڑکے جب کھرپا درانتی ہاتھ میں لینے کے قابل ہوتے ہیں تو ہم انہیں کام پر لگا دیتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ لڑکے نے پانچ جماعتیں پاس بھی کر لیں تو وہ کون سا پٹواری لگ جائے گا۔"

"چودھری!" اس نے نیا نیا سیکھا ہوا فلسفہ ء تعلیم بگھارنے کے لئے کتابی الفاظ کا سہارا لیتے ہوئے کہا "تعلیم بجائے خود مقصود بالذات ہے، ملازمت اس کا منتہائے مقصود نہیں۔ تعلیم آدمی کو اچھا انسان بناتی ہے۔" چودھری بڑے پُراسرا انداز میں مسکرایا۔

"کیا وہ کھرپا درانتی پہلے سے زیادہ اچھا چلائے گا؟" اس نے پوچھا۔

کس جاہل گاؤں سے واسطہ پڑا ہے۔" اس نے سوچا۔

اور اب سکول میں پہنچ کر وہ یکسر مایوسی کا شکار ہو گیا تھا کہ اسے اپنے ماحول کی کوئی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اصل میں اس نے بھی جو تعلیم حاصل کی تھی، اس کا منتہائے مقصود ملازمت ہی تھا اور جب ملازمت کا آغاز ایک اچھے سکول سے نہ ہوا

تو مایوسی بھی برحق تھی۔

اس نے کرسی سے اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ لڑکے بے کار کھڑے تھے' بلکہ حیران پریشان کہ کیا کریں۔ جھاڑو کسی کے ہاتھ میں نہیں تھا۔

اسے یکایک بہت غصہ آگیا۔ اس نے گرج کر کہا "میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ کوٹھڑی اور چھپر کا فرش صاف کرو۔"

لڑکے کوٹھڑی کے کونوں میں کھسک کھسک کر دبک گئے۔ ان کے چہرے ٹھس سے تھے۔ کوئی کچھ نہیں بتا رہا تھا۔ پتا نہیں کمرے صاف نہ کرنے میں کون سا سا جذبہ مانع تھا۔ اس نے سوچا' یہ چودھریوں کی اولاد ہیں' جھاڑو ہاتھ میں لینے سے سبکی محسوس کرتے ہیں۔ اس نے غصے سے گلوگیر آواز میں کہا "رانی خان کے بچو! کمرے صاف کرنے سے تمہاری ذات خراب ہوتی ہے۔ جواب دو۔ کچھ تو بولو۔ کھمبوں کی طرح کیوں کھڑے ہو؟"

ایک چھوٹا سا لڑکا جس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آنسوؤں میں جرات بھی لرز رہی تھی' آگے بڑھا اور اس نے کہا "منشی جی! ہم صفائی کس چیز سے کریں؟"

"کس چیز سے --- گاؤں سے جھاڑو بھی نہیں ملتا؟"

وہی لڑکا دوڑ کر گاؤں گیا اور جھاڑو لے آیا۔ نوجوان استاد نے سوچا یہ لڑکے کتنے کند ذہن ہیں' انہیں جھاڑو کی بھی نہ سوجھی۔ خدا خدا کر کے فرش صاف ہوئے۔ پھر ٹاٹ جھاڑے گئے تو سکول کے صحن میں مٹی کے بگولے اٹھے۔ فضا صاف ہوئی تو اس نے کہا "چلو! دعا کے لئے قطاروں میں کھڑے ہو جاؤ۔"

لڑکے قطاریں نہ بنا سکے تو وہ جھنجھلا گیا۔ "تمہیں قطاروں میں بھی کھڑا ہونا نہیں آتا جنگلیو! پہلی جماعت اگلی قطار میں اور دوسری اس سے پیچھے۔"

دوسری جماعت کے طالب علم تو ٹیڑھی میڑھی قطار بنا کر کھڑے ہو گئے لیکن پہلی جماعت کے طالب علم بھیڑوں کی طرح بکھرے رہے۔

اب اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ اس نے سر کے بالوں سے پکڑ پکڑ کر بچوں کو قطار میں کھڑا کیا اور بڑ بڑاتا رہا "اس گاؤں میں بھیڑیں رہتی ہیں۔ بھیڑیں۔"

قطاریں بن گئیں تو اس نے حکم دیا "دعا کہلانے والے لڑکے باہر نکل آئیں۔" کوئی آگے نہ بڑھا تو اس نے پوچھا "تمہیں دعا کہلانی بھی نہیں آتی۔"

"نہیں جی!" اسی لڑکے نے ڈری سہمی آواز میں جواب دیا جو گھر سے جھاڑو لے کر آیا تھا۔

"تو پھر مدرسے کیا کرنے آتے ہو، گھاس چھیلنے یا گلی ڈنڈا کھیلنے۔ میرے پیچھے پیچھے وہی کہو جو میں کہتا ہوں۔"

"تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا۔"

لڑکے ممیائے اور گھگیائے، عجیب عجیب سریں نکلیں، جیسے آرکسٹرا میں ہر ساز کے تار بے سُرے ہوں یا جیسے کہیں بلیاں میاؤں میاؤں کر رہی ہوں، کہیں پلّے چاں چاں کر رہے ہوں اور کہیں بھیڑیں ممیا رہی ہوں۔ اپنی اپنی ڈفلی، اپنا اپنا راگ۔

درختوں پر سے پرندے پُھر سے اُڑ گئے۔ ان کے لئے یہ راگ بالکل نیا تھا۔

"کیسی زمیں بنائی، کیا آسماں بنایا۔"

دوسرا مصرع اکثر طلبا کی زبانوں پر چڑھ کر کچھ سے کچھ بن گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا۔ آواز بیٹھ گئی۔ وہ تیسرا مصرع خود بُھول گیا۔" اس نے سٹپٹا کر کہا "چھپر کے نیچے چلے جاؤ۔" بچے یوں بھاگے جیسے ریوڑ کو گڈریئے نے باڑے سے ہانک دیا ہو۔

اس نے حاضری لی تو وہ بہت حیران ہوا کہ حاضری تقریباً" پوری تھی۔ ایک آدھ لڑکا غیر حاضر تھا۔ پڑھائی کا کام شروع ہوا تو اس نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ ہنوز روز اول ہے۔ دوسری جماعت کے طالب علموں کو پہلی جماعت کا قاعدہ بھی نہیں آتا تھا اور پہلی والے تو ابھی حرف شناسی کی منزل تک بھی نہیں پہنچے تھے۔ وہ قدم قدم پر مایوس ہو رہا تھا، تاہم اس نے اپنے دل میں کہا "میں اپنا فرض ادا کروں گا۔" وہ سارا

دن پڑھاتا رہا۔ ٹُوٹے ہوئے تختہ ء سیاہ پر لکھ لکھ کر مٹاتا رہا، تختیوں پر اصلاح دیتا رہا اور گھرکیوں جھڑکیوں میں اپنا اور طلبا کا خون جلاتا رہا۔

ایک دن ختم ہوا۔ وہ تھک کر چُور ہو چکا تھا۔

اس نے چھُٹی کا اشارہ کیا تو لڑکے مدرسے سے یوں نکلے جیسے رات بھر کے بند مویشی باڑے کا کھڑکا کھُلنے پر۔

کوٹھڑی میں ایک کھاٹ بچھی تھی۔ ایک میلا سا تکیہ بھی سرہانے پڑا تھا۔ وہ کھاٹ پر دراز ہو گیا۔ اتنے میں نمبردار نے اپنے کامے کے ہاتھ اس کا کھانا اور سامان بھیج دیا۔ کھانے کے بعد تنہائی کا دَور شروع ہوا۔ سکول کی بھائیں بھائیں کرتی فضا کاٹ کھانے کو دوڑی، اس نے سوچا ''دن کا وہ وقت جب سکول لگا ہوا تھا، اس تنہائی سے بہتر تھا۔'' پھر دنوں کا تسلسل یکسانیت اور یک رنگی میں ڈوب گیا۔

اس نے محنت سے کام کیا لیکن محنت کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت میں خشونت اور سختی بھی بڑھتی رہی۔ بچوں نے صبح کی دعا بھی یاد کر لی، صبح وقت پر صفائی ہو جاتی۔ ٹاٹ بھی وقت پر بچھ جاتے۔ اکثر بچے اپنا سبق بھی یاد کر لیتے لیکن اس کے باوجود وہ معجزہ رونما نہ ہوا جس کی اسے توقع تھی۔

یعنی اسے سکول اور سکول کے بچوں کے ساتھ محبت نہ ہو سکی۔ خاموش جامد گاؤں نے محبت کا کوئی منتر نہ پھُونکا کہ وہ اس کی مٹی سے چپک جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے بچوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر حد سے زیادہ غصہ آنے لگا۔ اس غصے میں اصلاح کا جذبہ بہت کم تھا البتہ دبی دبی نفرت ضرور تھی۔ سخت اور تُند الفاظ کے ساتھ ساتھ تھپڑ اور مکّے کا اضافہ بھی ہو گیا۔

کوٹھڑی میں رکھے اس چوبی صندوق سے کہ جس میں سکول کے رجسٹر اور دوسرا ریکارڈ رکھا تھا، اسے اپنے پیشرو کا مولابخش بھی مل گیا۔

پہلے چند دن وہ حاضری کی طرف سے مطمئن تھا۔

مولا بخش کی ایک جھلک دیکھ کر طلبا سہم سے گئے۔

اگلے دن ایک تہائی لڑکے غیر حاضر تھے حالانکہ اس نے ابھی مولا بخش کو استعمال بھی نہیں کیا تھا۔

اس نے تہیہ کر لیا کہ آج کے غیر حاضر طلبا کل جب حاضر ہوں گے تو میں مولا بخش سے ان کی ایسی پٹائی کروں گا کہ آئندہ کسی کو غیر حاضر ہونے کی جرات نہ ہو سکے گی۔

لیکن اگلے دن غیر حاضر طلبا کی تعداد نصف کے برابر تھی۔ صبح کی دعا میں دو قطاریں بھی مشکل سے بن سکیں۔

تب اس کا ماتھا ٹھنکا' اس نے ایک لڑکا بھیج کر نمبردار کو بلایا۔

"چودھری! مدرسے کی حاضری روز بروز کم ہو رہی ہے۔"

"منشی! میں نے بھی دیکھا کہ بچوں میں پڑھنے کا شوق کم ہو رہا ہے۔"

"اس میں میرا کیا قصور۔" نوجوان استاد نے تڑپ کر کہا۔ "میں تو بہت محنت سے کام کر رہا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ چند دنوں میں تیرے سکول کی کایا پلٹ دوں' پر تیرے گاؤں کے بچے بہت ناشکرے ہیں کہ میری محنت کا صلہ ضائع جا رہا ہے۔"

"منشی! تم سے پہلے جو استاد تھا' اس سے پڑھنے کے لئے بچے گھروں سے بھاگ بھاگ کر مدرسے آتے تھے۔ نجانے تو نے کیا کر دیا ہے کہ اب بچے مدرسے سے بھاگتے ہیں۔"

"میں نے کچھ کر دیا ہے؟" نوجوان استاد کا غصہ گلوگیر ہو گیا "یہ جو میرے ہاتھ میں ڈنڈا ہے' یہ بھی تو چھٹی پر جانے والے استاد کا ہے۔ میں نے تو ابھی اسے استعمال بھی نہیں کیا۔"

"ذرا غور سے دیکھو منشی' یہ ڈنڈا نہیں۔ یہ اس نے گاؤں کے بڑھئی سے بنوایا تھا۔ اس سے وہ کاغذ پر لکیر سیدھی رکھتا تھا۔" نمبردار بولا۔ نوجوان استاد نے ذرا غور کیا

تو اسے معلوم ہو گیا کہ یہ رُولر تھا' مولابخش نہیں تھا۔ اسے تھوڑی سی شرمندگی ہوئی لیکن اس نے ہار نہ مانی اور کہنے لگا "میں نے مدرسے کو مدرسہ سمجھ کر کام کیا ہے' مجھ سے پہلے استاد نے اسے کھیل کا میدان بنا لیا تھا کہ بچے یہاں دھماچوکڑی مچانے چلے آتے اور خوش خوش آتے۔ جو آدمی ٹھوس کام کرے گا' اس سے کون خوش ہو گا؟ میں تو محنت سے کام کرتا ہوں اور فرض کو فرض سمجھ کر ادا کرتا ہوں۔ کوئی سکول آئے نہ آئے' مجھے اس کی پروا نہیں---"

"تو پھر سن لے منشی! ایک دن ایسا بھی آئے گا جب تو مدرسے کی دیواروں کو پڑھایا کرے گا۔"

نمبردار یہ فقرہ کہہ کر چلا گیا لیکن طنز کی چبھن نوجوان استاد کو دیر تک محسوس ہوتی رہی اور ان کچوکوں کے ساتھ اس کا غصہ بھی تیز سے تیز تر ہوتا رہا۔

اس دن اس کے رویّے میں سختی کچھ حد سے بڑھی رہی! بھولے بھالے چہرے سارا دن ڈرے سہمے رہے۔ معصوم آنکھیں وحشت زدہ رہیں۔ لفظ زبانوں پر آ آ کر ٹوٹتے رہے۔ وہ بار بار سبق بھُول جاتے رہے۔

اس سے اگلی صبح دعا کے لئے مشکل سے ایک قطار ہی بن سکی۔ رجسٹر پر غیر حاضریوں کے طومار اُبھر کر مینار نظر آنے لگے۔ ناکامی کے مینار۔ اس کی پیشانی پر پسینہ آتا رہا۔ تب اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اگر دو چار دنوں تک حالات میں اصلاح نہ ہوئی تو وہ محکمے کو رپورٹ کر دے گا کہ گاؤں والے اس سے تعاون نہیں کرتے۔

اب اسے پورا پورا یقین ہو گیا تھا کہ نمبردار کی پیشین گوئی یقیناً" درست ثابت ہو گی۔ ایک دن واقعی اسے سکول کی دیواروں کو پڑھانا پڑے گا۔ اس نے حالات کا جائزہ لیا۔ بہت سوچا۔ نارمل سکول میں سیکھے ہوئے تمام اصول اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ فلسفہ ء تعلیم کی ایک ایک شق پر اس نے غور کیا' دلائل کی روشنی میں اس کے منطقی شعور نے ثابت کر دیا کہ وہ حق بجانب ہے۔ گاؤں والے خود مدرسے کو

ناکام بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ وہ تو اپنا فرض کماحقہ، ادا کر رہا ہے۔

منطقی شعور نے اسے حق بجانب ثابت کر دیا لیکن خشک منطق میں کسی بات کی کمی ضرور تھی کہ اسے اطمینان نصیب نہ ہوا گویا پھُولوں کے ایک تختے میں ترتیب بھی ہو اور تراش خراش بھی، سلیقہ بھی ہو اور مذاق سلیم کی کرشمہ زائی بھی، پھُول بھی کھِلے ہوئے ہوں لیکن پھر بھی ترتیب اور حُسنِ ترتیب میں کسی چیز کی کمی رہ گئی ہو یا جیسے ایک مجسمے کی مرمریں رعنائیوں میں روح کی گرمی اور گداز کا فقدان ہو۔

ممکن ہے کہ سزا و جزا کے ترازو کا سزا والا پلڑا جھک گیا ہو۔

نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کی اَنا نے اسے قبول نہ کیا۔

تاہم وہ اٹھا اور اس نے کوٹھڑی میں جا کر اپنے پیشرو کے رولر کو کہ جسے وہ مولا بخش سمجھتا رہا، چوبی صندوق میں بند کر دیا۔

وہ دن بڑی بے چینی کے عالم میں گزرا، بے چینی اور چبھن۔ ایک نامعلوم سی خلش، ایک عجیب سا خلا!

اگلی صبح بہت کم بچے حاضر ہوئے!

وہ گاؤں کی گلیوں کی طرف دیکھتا رہا، گلیاں سُونی اور اُداس نظر آئیں۔ وہ بچوں کی طرف منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ اس کا جسم مضمحل تھا اور روح تو ایک پہاڑ کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔

یکایک نمبردار ایک گلی سے نکلتا ہوا نظر آیا۔ اس کے آگے آگے بچوں کا گروہ تھا۔ ان کے ہاتھوں میں بستے اور تختیاں تھیں۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں جیسے بھیڑوں کو قصاب کی چھُری تلے ہانکا جا رہا ہو۔ کچھ بچے رو رہے تھے۔ نوجوان استاد یہ منظر دیکھ کر اور بھی اُداس ہو گیا۔

بچے سکول کے صحن میں داخل ہوئے تو وہ کُرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا جیسے وہ ان کا استقبال کر رہا ہو لیکن بھنچے بھنچے ہونٹوں اور چیں بر جبیں چہرے سے۔

نمبردار نے کہا "منشی! تیرے ریوڑ کو اکٹھا تو کر لایا ہوں، اب تیرا کام ہے کہ تو ان کو قابو میں رکھے۔"

"میں نے تو انہیں قابو میں رکھنے کے لئے ہر طریقہ استعمال کیا ہے۔" نوجوان استاد نے بجھی بجھی آواز میں جواب دیا۔

"نہیں!" نمبردار نے کہا "تُو نے صرف ایک طریقہ استعمال کیا ہے۔"

"ہاں!" نمبردار نے کہا "میں اَن پڑھ ہوں۔ پھر بھی اگر میں تیری جگہ ہوتا تو ان بچوں کو مدرسے سے بھاگنے نہ دیتا۔ ان کے ماں باپ خود انہیں آکر لے جاتے اور وہ بھی بڑی منت سماجت سے۔"

"وہ کون سا گُر ہے چودھری جی! ذرا مجھے بھی تو سکھا دیجئے۔" اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"دیکھ منشی! میں تو ڈھور ڈنگروں کا رکھوالا ہوں۔ میں اڑیل بیل کو چابک بھی لگاتا ہوں، پر کبھی کبھار اس کی گردن پر ہاتھ پھیر کر اسے پچکار بھی دیتا ہوں۔ تو صرف چابک لگانا جانتا ہے تجھے پچکارنا نہیں آتا۔" نوجوان استاد نے آنکھیں جھکا لیں۔

تاہم اس کے خیالات میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ وہ نوجوان تھا، پڑھا لکھا تھا، فلسفۂ تعلیم پر تھوڑی بہت نظر رکھتا تھا۔ ایک ان پڑھ چودھری اسے سبق سکھا رہا تھا۔ اس کی اَنا کو ٹھیس پہنچ رہی تھی، اس کے جذبۂ خود پرستی کو شکست ہو رہی تھی۔ وہ اس حکمت کو جو بے شک تجربے کی کٹھالی میں ڈھل کر ضرور پختہ اور سچّی ہو گئی تھی لیکن پھر بھی ایک اَن پڑھ ذہن کی پیداوار تھی کیسے قبول کرے۔

"نہیں! نہیں!" اس کی جھوٹی اَنا چیخ اٹھی۔

"منشی!" چودھری نے کہا "نوجوان ہے۔ تیرا خون گرم ہے۔ تُو لڑائی ہارنا نہیں چاہتا پر دیکھ تیری لڑائی تو بچوں سے ہے، بڑوں سے نہیں اور پھر بچے کوئی پتھر کی سلیٹیں تو نہیں کہ چاک سے لکھ کر مٹا دیا۔ انہیں انسان سمجھ کر ان سے انسانوں کا

سا برتاؤ کر تو دیکھ تیرا مدرسہ کیسے آباد ہوتا ہے۔"

"چودھری! میں تیرے مشورے پر غور کروں گا۔" اس نے بڑائی کے جذبے کا اظہار کیا اور کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

لیکن ابھی وہ اس مشورے پر عمل کرنے کے لئے نفسیاتی طور پر تیار نہ ہوا تھا' ابھی اس کا ذہن خالی تھا اور روح بیدار نہ ہوئی تھی۔

پھر یکایک ذہن کا ایک دریچہ کھٹ سے کھلا۔

تصور نے ایک لمبی اڑان لی۔ نارمل سکول کے ایک بزرگ استاد نے بڑے شستہ انداز میں ایک شعر پڑھا۔

درسِ ادیب گر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بہ مکتب آورد طفلِ گریز پائے را

اور شعر کی موسیقی اس کے دل و دماغ میں رچ گئی۔

تب بزرگ استاد نے فرمایا "یہ شعر اکبر اور جہانگیر کے عہد کے ایک فارسی شاعر ملاّ نظیری کا ہے۔ اس کا ترجمہ ہے کہ اگر ادیب کا سبق محبت کا نغمہ ہو تو جمعہ کا دن (تعطیل کا دن) بھی مدرسے سے بھاگ جانے والے طالب علم کو مدرسے لے آیا کرتا ہے۔"

اس شعر کا ترجمہ یاد آیا تو اسے یوں لگا جیسے اس کی روح ایک خوابِ گراں سے یکایک بیدار ہو گئی ہو۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے اپنا ماحول بدلا ہوا نظر آیا گویا آسمان سے محبت کے چھینٹے پڑے ہوں اور دھول سے اٹی درختوں کی سرسبزی دھل کر زمردیں بن گئی ہو۔ کچھ چھینٹے اس کی روح میں گرے اور وہ ایک کیفِ فراواں سے لبریز ہو گئی۔ پرندوں کے چہچہے جنت کے نغموں میں ڈھل گئے۔ کائنات کی ہر شے پر ایک نیا رنگ آ گیا تھا۔

نیا رنگ--- نیا آہنگ!"

اور نمبردار جا چکا تھا۔

بچے بھیڑوں کی طرح دبک کر اس کے سامنے کھڑے تھے۔

اس نے مسکرا کر کہا "کیوں بھئی آ گئے تم؟ دوست تو اتنے بے وفا نہیں ہوتے۔" اور اس مسکراہٹ میں نجانے کون سا جادو تھا کہ تمام چہرے پھولوں کی طرح ترو تازہ ہو گئے اور پھر چڑیوں کی طرح چہچہانے لگے جیسے بہار کے آنے پر ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے ہوں۔

(اکتوبر ۱۹۹۱ء)



تک ان کا چہرہ غصے کی وجہ سے سرخ تھا۔ کہنے لگے "اوہ بھائی لڑکے! کیا نام ہے تیرا؟"

"عبد المجید۔"

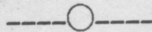
"میاں عبد المجید! جنگ زوروں پر ہے اور انگریز نے فوج میں افسروں کی بھرتی کے لئے دروازے چوپٹ کھول دیئے ہیں۔ تم مجھے ہر لحاظ سے فٹ نظر آتے ہو جاؤ کمشن کے لئے اپلائی کرو۔"

"جی نہیں! میں فوج میں نہیں جانا چاہتا۔ میں انگریز کی بقاء کے لئے توپ کا ایندھن نہیں بننا چاہتا۔ میں ٹیچر بن کر قوم کی خدمت کروں گا۔"

"بکواس! قوم کی خدمت! نری بکواس! لڑکے! میں ایم اے بی ٹی ہوں۔ انٹر کرنے کے بعد میں نے بہت کوشش کی کہ مجھے کوئی معمولی سی نوکری مل جائے لیکن اس زمانے میں بڑی کساد بازاری تھی' میں فوج میں جا سکا' نہ پولیس میں۔ محکمہ مال میں بھی میرے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ مجبوراً" بی اے کیا' پھر ایم اے کیا اور مقابلے کے ہر امتحان میں فیل ہونے کے بعد میں نے بی ٹی کر لی۔ پٹوار بھی مل گئی ہوتی تو آج میں اگر نائب تحصیلدار نہیں تو گرداور قانون گو تو ضرور ہوتا۔۔۔۔"

"جی میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ بولا "کیا آپ مجھے کسی قصبہ کے مڈل یا ہائی سکول میں نہیں لگوا سکتے؟"

"لگوا سکتا ہوں لیکن نہیں لگواؤں گا۔ ڈی آئی نے تمہیں ایک گاؤں میں اس لئے بھیجا ہے کہ تم بی اے نہ کر سکو کیونکہ تم مسلمان ہو اور میں بھی تمہیں مڈل سکول میں اس لئے نہیں لگواؤں گا کہ تم مسلمان ہو اور وہاں بی اے کر لو گے۔ نتیجہ ایک ہی ہے لیکن نیتوں میں فرق ہے۔" شیخ صاحب بولے۔



ایک دیہاتی نے کہا "چک نمبر پندرہ! بس سمجھ لو "سدپند" کے فاصلے پر ہے۔ "سدپند" کا مطلب اسے سمجھ میں نہ آیا تو اس نے کہا "یہ بتاؤ۔۔۔ کتنے میل؟"

"یہ نہ پوچھو۔ بس یہاں سے آواز دو تو وہاں تک پہنچ جائے۔" دیہاتی بولا۔

وہ ایک نہر کے کنارے پر کھڑا تھا۔ چک نمبر پندرہ کے پُل پر اسے اتار کر ڈرائیور کنارے کی سڑک پر دھول اڑاتا ہوا بس کو دوڑا لے گیا تھا۔ وہ اس سٹاپ کا اکیلا مسافر تھا۔ اس کے سر پر شیشم کا سایہ تھا اور قدموں میں اس کا سوٹ کیس پڑا تھا اور اس کے اوپر بستر۔ گرمی اور لو میں اتنا سا ڈھیر اسے کنچن چنگا کی چوٹی سے بھی بلند نظر آ رہا تھا۔ وہ کچی سڑک جو چک پندرہ کو جاتی تھی، ہر قسم کے مسافر نواز سائے سے محروم تھی۔ کناروں پر کچھ جھاڑیاں تھیں جو دھول سے اٹی ہوئی تھیں اور تیز دھوپ کے لہریئے ان پر اڑ رہے تھے، کبھی کبھار کوئی ننھا سا بگولا بھی آتا اور جھاڑیوں کو تھرتھرا کر سڑک پار کر جاتا۔

اس نے بستر کندھے پر رکھا اور سوٹ کیس ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ گدھے پر سوار ایک جوان نے اس سے پوچھا۔ "کہاں جاؤ گے؟"

چک نمبر پندرہ!"

"چک نمبر پندرہ میرے رستے میں پڑتا ہے۔ میرے آگے صندوق اور بستر رکھ دو اور خود قدم سے قدم ملا کر چلتے رہو۔" نوجوان بولا۔

چند گز چلنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہو تو گدھے اور آدمی کی رفتار میں بہت فرق ہے۔ ایک لطیفہ بے اختیار اسے یاد آ گیا تو وہ کھلکھلا کر ہنسا۔

گدھے والے نے پوچھا "بابو! کیا بات ہے! بڑے خوش ہو۔"

"ایک لطیفہ یاد آ گیا ہے اگر سننا ہے تو گدھے سے اترنا پڑے گا۔"

گدھے والا بھی یقیناً حس ظریفانہ کا مالک تھا کہ فوراً" گدھے سے اتر آیا۔ لطیفہ سن کر وہ بہت ہنسا کہنے لگا "میرا ایک گدھا بہت اڑیل ہے ایک چٹکی اس پر بھی آزماؤں گا۔"

"اور اگر گدھا تم سے آگے نکل گیا تو کیا کرو گے؟" اس نے پوچھا۔

گدھے والے نے ذرا شرما کر کہا "پھر وہی چٹکی اپنے آپ پر آزماؤں گا۔"

"لیکن دونوں صورتوں میں نتیجہ تو ایک ہی رہے گا۔ پہلے گدھا آگے نکل جائے گا پھر تم گدھے سے آگے نکل جاؤ گے۔ لٰہذا ثابت ہوا کہ انسان اور گدھا قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتے۔"

چنانچہ گدھے والے نے "چھٹ" میں ایک طرف بستر رکھا اور دوسری طرف سوٹ کیس۔ توازن ٹھیک کرنے کے بعد وہ اس سے ہم قدم ہو گیا۔ اثنائے سفر میں ایک دوسرے سے پورا پورا تعارف ہو گیا۔ وہ چک پندرہ سے اگلے چک یعنی چک نمبر سولہ کا کمہار تھا۔ گاؤں والوں کو مٹی کے برتن مہیا کرنے کے علاوہ بار برداری کا کام بھی کرتا تھا۔ آج سے نصف صدی پہلے ہر گاؤں ایک اقتصادی یونٹ ہوا کرتا تھا۔ کسان اناج پیدا کرتا تھا، ترکھان، لوہار، موچی، نائی، دھوبی، کمہار اور تکیے کا فقیر نظامِ معیشت چلانے میں اس کی مدد کرتے تھے۔ اب بھی پنجاب اور سندھ میں بہت سے گاؤں ایسے ہیں جہاں یہ نظام زندگی کسی نہ کسی صورت میں چل رہا ہے۔

جس گاؤں میں وہ استاد لگ کر گیا تھا، وہاں ابھی تک اس نظام زندگی میں کوئی رخنہ نہیں پڑا تھا۔

کمہار اسے گاؤں کے نمبردار کے ڈیرے پر لے گیا۔ یہ نمبردار ہندو تھا۔

اس نے پوچھا "منشی جی! آپ ہندو ہیں یا مسلمان؟"

"میں مسلمان ہوں۔"

اس نے کمہار سے مخاطب ہو کر کہا "لگتا ہے تو اس گاؤں کا رہنے والا نہیں؟"

"نہیں جی! میں چک سولہ کا رہنے والا ہوں۔"

"منشی جی کو نمبردار چوہدری مستقیم کے ڈیرے پر لے جا--- منشی جی! کوئی اور ٹہل سیوا؟"

''بس جی شکریہ ! اتنی ہی ٹہل سیوا کیا کم ہے کہ آپ نے میری راہنمائی کر دی۔'' وہ بولا۔ اور نمبردار نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''چند قدم دُور جا کر اس نے نوجوان کمہار سے کہا ''یار ! میں تمہارا نام پوچھنا ہی بھول گیا۔''

وہ بولا ''میرا نام پنوں ہے۔''

''واہ ! واہ ! کیا اچھا نام ہے۔''

اس نے پہلی بار پنوں کے سراپے پر بھرپور نظر ڈالی۔ چھریرا بدن' گندمی رنگ' موٹی موٹی آنکھیں اور اوپر کے ہونٹ پر مونچھ کی پتلی سی لکیر جسے ابھی قینچی بھی نہ لگی تھی۔ اس کے سراپے میں اسے رانجھے' پنوں اور مہینوال والی ہر وہ ادا نظر آئی جو استاد اللہ بخش مصور نے دیکھی تھی اور صفحہ ء قرطاس پر منتقل کر دی تھی۔

اس نے پوچھا ''پنوں کی کوئی سسّی بھی ملی یا نہیں ؟''

پنوں نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔

''تمہار نام تو مہینوال ہونا چاہیئے تھا۔'' اس نے کہا اور پھر اپنی بات پر خود ہی شرمندہ ہو گیا کہ سوہنی تو کمہارن تھی۔ کیا پتا اس بات پر نوجوان کمہار کو کتنا دکھ ہوا ہو۔

اس نے بات بدل کر کہا ''پھر سوہنی اپنے ہی گھر میں رہتی اور چناب عبور کر کے کسی عزت بیگ سے تو ملنے نہ جاتی اور ڈوب کر جان نہ گنواتی۔''

معلوم ہوا کہ پنوں نے اس کی کسی بات کا نوٹس نہیں لیا تھا۔

وہ کہنے لگا ''منشی جی ! نمبردار نے تمہیں لسّی پانی بھی نہ پُوچھا۔ کوئی پٹواری اس کے ڈیرے پر آتا تو اس کے آگے پیچھے بچھ بچھ جاتا۔ تم پٹواری کیوں نہ بنے؟''

''آدمی وہی بنتا ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''منشی جی ! پتا ہے اس نمبردار کا نام کیا ہے ؟---'' اس کے جواب کا انتظار کئے

بغیر خود ہی بولا "ماں باپ نے اس کا نام کرم چند رکھا تھا۔ لوگوں نے اس کا نام کھوتا رام رکھ دیا۔ اور اب چک پندرہ کو لوگ "کھوتی پور" بھی کہتے ہیں۔"

پنوں ہنسا تو وہ بھی بے اختیار ہنس پڑا حالانکہ نمبردار کے رویے سے وہ خاصا دل شکستہ ہو گیا تھا۔

نمبردار مستقیم کا ڈیرا گاؤں کے انتہائی شمال میں تھا۔

اس نے چھوٹتے ہی کہا "اچھا! تو تم ہو نئے منشی ؟"

"جی ہاں !" وہ بولا۔

"معلوم ہے، تم جس منشی کی جگہ آئے ہو، اسے کس کی شکایت پر بدلا گیا؟"

"مجھے معلوم نہیں۔"

"میری شکایت پر اور یہ بھی پتا ہے کیوں ؟"

"جی نہیں !"

"وہ بودے واہ کر گاؤں کی گلیوں میں پھرتا تھا اور ہماری دھیوں بھنوں کو تاڑتا تھا۔" نمبردار نے خضاب لگی مونچھ کو بل دے کر کہا۔

نمبردار مستقیم پچاس پچپن کے پیٹے میں تھا۔ سر پر رنگین صافہ، آنکھ میں کاجل اور پاؤں میں زری کا کھسا۔ لگتا تھا کہ دو چار مربع زمین کا مالک ضرور ہے اور ان عورتوں کا شوقین بھی جو دوسروں کے دھییں بھنیں تھیں۔

"منشی کو مدرسے لے جاؤ" اس نے نوجوان کمہار کو حکم دیا۔

جب گدھا چل پڑا تو وہ بولا "منشی ! کوئی خدمت تواضع ؟"

"شکریہ چوہدری ! اتنی ہی خدمت کافی ہے۔"

اس کے لہجے میں جو طنز تھی، وہ نمبردار مستقیم نے محسوس کر لی کیونکہ اس کی مونچھ کے دو چار بال تھرتھرا گئے تھے۔

سکول کی عمارت گاؤں سے ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ دو کچے

کمرے جن کے آگے برآمدہ تھا۔ ایک کونے میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی اور ایک پھونس کا چھپر۔ گاؤں کا ماحول ہرا بھرا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ زمین قابل ہے اور اسے پانی وافر ملتا ہے لیکن زمین کے جس ٹکڑے پر سکول کی عمارت بنی تھی' اسے کلر کھا گیا تھا اور پھُولی پھُولی مٹی میں پاؤں دھنستے تھے۔ سکول کی کچی چار دیواری گری پڑی تھی۔ کہیں کہیں دیوار کے آثار باقی نظر آتے تھے اور اب کچے کمروں کو بھی کلر کھا رہا تھا۔ سکول کے صحن کے وسط میں اوکاں کا ایک بوڑھا درخت کھڑا تھا اور اس کے سائے میں ہینڈ پمپ لگا تھا۔ اوکاں کے سائے تلے زمین میں کلر نہیں تھا البتہ بھیگی بھیگی سی دکھائی دیتی تھی۔

وہ' پنوں اور گدھا کوٹھڑی کے سامنے جا کھڑے ہوئے' تو اندر سے ایک میلا سا دھوتی پوش برآمد ہوا۔

پوچھنے لگا "آپ کون ہیں ؟"

"میں منشی لگ کر آیا ہوں۔"

"آپ کا نام ؟"

"عبد المجید۔"

"منشی عبد المجید جی ! میرا نام منسارام ہے۔ آیئے ! پدھاریئے ! پر کیا آپ ایک ہندو کے ساتھ گزارا کر لیں گے ؟"

"کیا مطلب ؟"

"میرے ساتھ ایک کمرے میں رہ لیں گے ؟"

"میں تو رہ لوں گا لیکن آپ کیا کریں گے ؟ آپ کا دانہ پانی بھرشٹ ہو جائے گا۔"

"میرا بھی یہی مطلب تھا۔" لالہ منسارام بڑی لجاجت سے بولا۔

تاہم از راہ مہمانداری اس نے ایک کھاٹ اندر سے نکال کر باہر بچھا دی۔ یہاں

مکان کا سایہ کھاٹ کے برابر رہ گیا تھا۔

''بیٹھیے! اس نے کہا ''کوئی جل پانی؟''

اس نے پنوں سے کہا؟ یار! تیرا بہت بہت شکریہ۔ اب تو جا' سامان اتار کر کھاٹ پر رکھ دے۔''

پنوں بولا ''منشی! جب یہ گاؤں تجھے قبول نہیں کرتا تو میرے ساتھ میرے گاؤں کیوں نہیں چلتا؟''

''اپنے گاؤں ہی لے جانا پر انہیں پہلے بڑے منشی جی سے تو مل لینے دے۔'' لالہ منسارام نے خوش ہو کر کہا۔

''وہ کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ چک ہی میں رہتے ہیں۔'' لالہ جی بولے۔

وہ تذبذب میں پڑ گیا تو پنوں بولا ''منشی! سوچ میں کیوں پڑ گئے ہو' ''چلو میرے ساتھ کل صبح سکول لگے تو بڑے منشی سے مل لینا۔''

گاؤں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا' اس سے بیچارے کا دل پژمردہ ہو گیا تھا گویا قومی خدمت کے بیج سے جو اکھوا پھوٹ رہا تھا' اسے لُو کا ایک جھونکا جھلس گیا تھا۔ کلر اٹھی دھول اس کے ہونٹوں پر پپڑی جما گئی تھی اور منہ کا ذائقہ حلق تک کڑوا ہو چکا تھا۔ ہینڈ پمپ پر اس نے اوک سے پانی پیا اور پنوں کو بھی پلایا۔ گدھا بڑے صبر شکر سے انہیں پانی پیتے دیکھتا رہا۔

چک نمبر پندرہ اور سولہ کے درمیان ایک چھوٹا سا راجباہ حائل تھا اس پر پلیا موجود تھی۔ یوں اسے پھلانگا بھی جا سکتا تھا۔ اس ایک پھلانگ پانی سے اس علاقے کی سرسبزی و شادابی قائم تھی بلکہ چرند' پرند اور انسانوں کی زندگی بھی جو اس علاقے میں بس رہے تھے۔ چک سولہ میں داخل ہوتے ہی ایک احاطے میں اسے چاک چلتا ہوا نظر آیا۔ مٹی کے کچھ برتن دھوپ میں سوکھ رہے تھے۔ ایک کونے میں آوا سلگ رہا تھا۔

جونہی وہ احاطے میں داخل ہوئے چاک پر بیٹھا ہوا آدمی اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا "پنوں آج بہت دیر لگا دی؟" پھر اچانک اجنبی پر نظر پڑی تو پوچھا "یہ مسافر اسی چک کا ہے یا کہیں آگے جائے گا؟"

"آج رات یہیں رہے گا۔ چک پندرہ میں منشی لگ کر آیا ہے۔" پنّوں بولا۔

"کیا کہہ رہے ہو' یہیں رہے گا؟ ہمارے گھر میں؟ پگلے! سوچ تو لیا ہوتا' ہمارا گھر اس شہری بابو کے قابل بھی ہے کیا؟ پنوں کا باپ بولا۔

"چک پندرہ نے اسے قبول نہیں کیا تو بیچارہ کہاں جاتا۔" پنوں نے سارا قصہ سنایا تو باپ کہنے لگا "چک پندرہ والے تو ازل سے کمینے ہیں۔ سنا ہے' ان کے بزرگ مہمان پر کتے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ جا! منشی جی کو چھپر تلے بٹھا۔"

ایک رنگیل پلنگ چھپر کے نیچے بچھ گیا۔ سرہانے تکیہ رکھا گیا اور پائینتی پر کھیس بچھایا گیا۔ پنوں نے اس کا سامان پلنگ کے پاس رکھ دیا۔ تکیے پر سر رکھتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

پنّوں نے اسے کندھے سے ہلا کر کہا "منشی! اُٹھ! کچھ کھا پی لے۔"

پہلے پنّوں نے مٹی کے لوٹے سے اس کے ہاتھ دُھلائے' پھر چھابا اس کے آگے رکھ دیا۔ اس نے دسترخوان میں لپٹی ہوئی روٹیاں نکالنے سے پہلے پانی مانگا۔ پنّوں نے ایک کوزے میں مٹکے سے لسی انڈیلی۔ لسی نمکین تھی اور ٹھنڈی بھی اور اس سے کورے گھڑے اور کوزے کی خوشبو آ رہی تھی۔ روٹیاں دیسی گھی سے چُپڑی ہوئی تھیں اور ایک پیالی میں اچار تھا' لسوڑوں' ڈھیلوں اور آم کے اچار سے وہ بڑی بڑی دو روٹیاں کھا گیا۔ اتنی لذت آج سے پہلے اسے کسی کھانے میں نہ ملی تھی۔

اگلی صبح پنّوں کے مشورے پر اس نے سامان وہیں رہنے دیا اور سکول جانے کے لئے اکیلا روانہ ہو گیا۔ راستے کی جھاڑیوں میں اس نے تیتر کی بولی سنی اور قسم قسم کی چڑیاں دیکھیں۔ ایک سانپ بھی بجلی کا لہریا بن کر اس کا راستہ کاٹ گیا۔ چک نمبر

پندرہ کے کتّے بھی اس پر بھونکے۔

ابھی سکول میں ہو کا عالم تھا۔ لالہ منسارام نلکے پر نہا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا۔

"سکول کب لگے گا؟" اس نے پوچھا۔

"جب لڑکے آجائیں گے؟"

"اور لڑکے کب آئیں گے؟"

"جب ان کا جی چاہے گا۔" لالہ منسارام نے جواب دیا۔

پھر لڑکے اکا دُکا آنے شروع ہو گئے اور مدرسے کے صحن میں دھول اُڑنے لگی۔ لڑکوں نے ٹاٹ جھاڑے، اتنی دھول اُٹھی کی زمین آسمان ایک ہو گئے۔ کچھ لڑکوں نے بالٹیاں بھر بھر کر چھڑکاؤ کیا۔ مٹی اتنی رُوکھی تھی کہ اس سے خُوشبو بھی نہ اٹھی البتہ دُھول بیٹھ گئی۔

جب چالیس پچاس لڑکے اکٹھے ہو گئے تو منسارام جی بھی اپنی کوٹھڑی سے نکل آئے۔ ان کا کرتہ دھوتی کچھ اُجلے سے نظر آئے اور سر پر مختصر سے پگڑی میں بھی کچھ وقار دکھائی دیا، البتہ اس میں سے ان کی بودی خاصی مضحکہ خیز انداز میں جھانک رہی تھی۔ انہوں نے لڑکوں کو قطار میں کھڑا کیا اور دو لڑکوں سے نہایت بے سری آواز میں حمد کہلوائی۔ اوکاں کے سائے تلے کچھ ٹاٹ بچھائے گئے اور ایک کرسی رکھی گئی جس کی سیٹ پر نہایت کھُردرا سا پھٹا لگا تھا۔ کچھ لڑکے کمرے کے اندر چلے گئے، کچھ برآمدے میں بیٹھ گئے، ایک جماعت چھپر تلے چلی گئی اور باقی لڑکے جو بچے وہ اوکاں کے نیچے ٹاٹوں پر بیٹھ گئے۔

لالہ منسارام نے کہا "منشی عبد المجید جی! اوکاں کے نیچے جو جماعت بیٹھی ہے وہ آپ کی ہے۔"

وہ بولا "لالہ جی! ابھی تو اپریل کا مہینہ ہے اور سائے میں کچھ خُنکی ہے جون کی

لُو اور برسات کی حبس میں میری جماعت کہاں لگے گی؟"

یکم مئی سے "واڑھی کی چھٹیاں ہو جائیں گی۔ مئی کا پورا مہینہ چُھٹیاں رہیں گی اور جون میں واڑھی ختم نہ ہوئی تو مدرسے میں خود بخود چھٹی رہے گی کیونکہ کوئی لڑکا پڑھنے کے لئے نہیں آئے گا۔ برسات اس علاقے میں لگتی ہی نہیں۔ ایک آدھ بارش ہو بھی گئی تو چُھٹی کر دی جائے گی۔"

ابھی اول مدرس نہیں آئے تھے۔ لالہ منسارام جی اپنی جماعت لے کر چھپر تلے چلے گئے۔ وہ کھردری سیٹ والی کرسی پر جا بیٹھا۔ لڑکے اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگے، کچھ حیران، کچھ سہمی سہمی اور کچھ منتظر نگاہوں سے کہ دیکھئے مداری کی پٹاری سے کیا نکلتا ہے؟ وہ ان سے ہم کلام نہ ہوا کیونکہ وہ یکایک نہایت مایوس ہو گیا تھا اور ایک نہایت کڑوے کسیلے پچھتاوے نے اسے آلیا تھا کہ وہ شہر کی گہما گہمی چھوڑ کر اس ویرانے میں کیوں چلا آیا؟ اب ویرانے میں دل نہ لگا تو اسے چھوڑ کر کہاں جائے گا؟ کیا اس نے غلط فیصلہ تو نہیں کیا؟

اس کے سامنے جو بچے بیٹھے تھے، کتنے میلے میلے اور اجنبی سے تھے۔ میلے کپڑے اور میلے چہرے۔ سکول آنے سے پہلے کسی ماں نے اپنے بچے کا منہ نہیں دھلوایا تھا۔ ان کے کپڑوں سے پسینے کی بُو آ رہی تھی۔ یہ بچے سکول آنے پر مجبور تھے کہ یہاں لازمی تعلیم کا ایکٹ نافذ تھا اور ہر بچے کے لئے چار جماعتیں پڑھنا ضروری تھا۔ دیہات کی معیشت میں بچے کی تعلیم منافع بخش بھی نہیں تھی بلکہ والدین بچے کی خدمات سے محروم ہو جاتے تھے۔ جونہی بچے کے ہاتھ میں اتنی سکت آتی کہ وہ کھُرپا درانتی پکڑ سکے، باپ کا مددگار بن جاتا۔ اور کچھ نہیں تو مویشیوں کی دیکھ بھال تو کر سکتا تھا۔ بچوں کو لازمی تعلیم سے بچانے کے لئے لوگ افسر لازمی تعلیم کی خوشامد کرتے، سفارشیں کرواتے اور رشوت بھی پیش کرتے۔

اس نے سوچا "اس ماحول سے میں کیسے مطابقت پیدا کر سکوں گا۔"

اتنے میں اول مدرس آ گئے اور اُس کی سوچ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ وہ درمیانی عمر کے سفید پوش آدمی تھے' خشخشی داڑھی میں کچھ سفید بال بھی تھے۔ سر پر کُلّے والی پگڑی تھی جس پر طرّہ تھا اور بمقدارِ علم شملہ بھی۔

بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر بولے "منشی عبدالمجید جی! کل آپ غریب خانے پر کیوں تشریف نہ لائے؟"

اس نے پورا قصہ سنا کر کہا کہ جس طرز کے استقبال سے مجھے واسطہ پڑا اس سے میں نے یہی بہتر سمجھا کہ آپ کو نہ آزماؤں اور پنوں کے ساتھ چک نمبر سولہ چلا جاؤں۔

"بہتر تھا کہ آپ مجھے آزما لیتے۔" اول مدرس نے ہنس کر کہا "آپ کی رہائش کا انتظام یہیں ہو جائے گا۔ منشی فصل دین اکیلے رہتے ہیں۔ آپ ان کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ وہ ایک ہفتے کی چھٹی پر ہیں جب تک وہ نہ آئیں آپ میری بیٹھک میں رہیں۔"

پھر اُنہوں نے پوچھا "آپ نے یہ محکمہ کیوں چنا؟"

"اس میں قومی خدمت کے بہت سے مواقع ہیں۔" وہ بولا لیکن اس کی آواز میں یقین' اعتماد اور وثوق کی قوت مفقود تھی۔

"لیکن اس محکمے میں ترقی کے مواقع بہت کم ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔"

اول مدرس نے کہا "کم از کم آدمی افسر نہیں بنتا۔"

"ایک استاد بی ٹی کر کے ڈسٹرکٹ انسپکٹری تک تو ترقی کر سکتا ہے۔ کیا یہ افسری نہیں۔؟" اس نے پوچھا۔

"ہے--- لیکن اس افسری کا ایک لطیفہ آپ سنیں گے۔"

"فرمایئے!"

"ایک ڈسٹرکٹ انسپکٹر ایک ایسے سکول کا معائنہ کرنا چاہتے تھے جس کے راستے میں ایک برساتی نالہ حائل تھا جو اکثر خشک رہتا--- اتفاق سے اس دن پیچھے کے

علاقے میں بارش ہو گئی اور نالے میں گھٹنوں گھٹنوں پانی بہہ رہا تھا۔ اے ڈی آئی نے کہا "صاحب! چلئے واپس چلتے ہیں۔" ایک دیہاتی بھی وہاں کھڑا تھا۔ اس نے "صاحب" کا لفظ سنا تو آگے بڑھ کر کہا "میں صاحب کو دوسرے کنارے پہنچا آتا ہوں۔" چنانچہ اُس نے صاحب کو پیٹھ پر بٹھایا۔ جب نالے کے عین درمیان پہنچا تو پوچھا "صاب جی! آپ خیر سے کس محکمے کے افسر ہیں۔" وہ بولے "سکولوں کے محکمے کے۔" دیہاتی بولا "یہ تم نے پہلے کیوں نہ بتایا؟" اور دھڑام سے اُسے نالے میں پھینک دیا۔"

قصہ سنا کر وہ کہنے لگے "میرا مطلب آپ کو مایوس کرنا نہیں۔"

دوپہر تک اس نے اپنی جماعت کے لڑکوں کا جائزہ لیا۔ یہ دوسری جماعت کے بچے تھے۔ اُنہیں پہلی کا قاعدہ بھی نہیں آتا تھا۔ "بہرحال سال کا آغاز ہے محنت سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔" اس نے سوچا۔

"لیکن تم یہاں پڑھانے کے لئے تو نہیں آئے پڑھنے کے لئے آئے ہو۔" کسی نے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔

"پر ان بچوں کا کیا قصور جنہیں میری تحویل میں دے دیا گیا ہے۔ کیا مجھے انہیں پڑھانے کا معاوضہ نہیں ملے گا؟" اُس کی سوچ نے جواب دیا۔

اسی تذبذب اور بحث مباحثے میں پڑھائی کا ایک دن ختم ہو گیا۔ دوپہر کا کھانا اس نے اول مدرس کے ہاں کھایا۔ جب وہ چک سولہ میں پہنچا تو سہ پہر کا وقت تھا اور پنوں اُس کے انتظار میں تھا۔

"بہت دیر لگا دی منشی جی!" پنوں نے کہا۔

اُس نے دن کی پوری روداد سنا کر کہا "یار پنوں! مجھے منشی جی کہہ کر نہ پکارا کرو، میرا نام مجید ہے۔"

پنوں نے اسے پھر بھی مجید کہہ نہ کر پکارا بلکہ کہا "یار منشی! میں نے بابا سے بات کر لی ہے۔ ہم اس چھپر کو ٹھیک ٹھاک کر دیں گے۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے، یہیں

رہو گے۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔"

اَس نے اقرار کیا نہ انکار، تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو!

ایک ہفتے کے اندر اندر چک سولہ سے مدرسے جانا اور وہاں سے واپس آ کر پنوں کی خدمت تواضع سے لطف اندوز ہونا اور رات کو لالٹین کی روشنی میں دیر تک پڑھتے رہنے کا ایک معمول خود بخود قائم ہو گیا۔

منشی فضل دین کے چھٹی سے واپس آنے پر وہ تذبذب میں پڑ گیا کہ چک نمبر پندرہ میں آ جائے یا سولہ میں پنوں کے پاس رہے۔ وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

اس نے کہا "منشی فضل دین جی! واڈھی کی چھٹیاں ہونے والی ہیں، ان کے بعد میں آپ کے ہاں شفٹ ہو جاؤں گا۔"

چک سولہ کے قیام کا دسواں یا بارھواں دن تھا۔ دوپہر کی دھوپ میں خاصی چکا چوند تھی۔ سکول سے واپسی پر اُسے خاصی گرمی بھی لگتی تھی اور چھپر کے سائے تلے اُسے بہت سکون محسوس ہوا تھا کہ اچانک اَسے یوں لگا جیسے دوپہر کی دھوپ چھپر کے سائے پر غالب آ گئی ہو اور اُس کی آنکھیں چندھیا گئی ہوں۔



پتہ نہیں وہ ایران کے کس شہر سے آیا تھا، اصفہان یا شیراز سے، اَس کا نام مرزا عزت بیگ تھا اور وہ گجرات شہر کی سیر کرتے کرتے اَس بازار میں نکل گیا جہاں تلّے کمہار کی دکان تھی۔ وہاں وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا کہ وہاں ایک نازک اندام لڑکی، چندے آفتاب چندے ماہتاب، نازک نازک صراحیاں اور آبخورے بیچ رہی تھی۔

پھر عزت بیگ کا قدم اَس گلی سے آگے نہ بڑھ سکا۔

وہ اپنے ہم وطن شیراز کے شاعر کی طرح اَس کے سیاہ تِل پر سمرقند و بخارا تو نچھاور نہ کر سکا لیکن اُس نے بانات و کمخواب کے تھان اَس کے قدموں تلے بچھا دیئے اور خود عزت بیگ سے مہینوال بن گیا۔

آج وہی لڑکی شرمائی لجائی چھابے میں روٹیاں اور گڑوے میں نمکین لسی بھرے اُس کے سامنے موجود تھی اور چھپر کے سائے تلے دھوپ کی چاندنی بچھ گئی تھی۔

وہ لڑکی چھابا اور گڑوا چارپائی پر رکھ کر چند لمحے منتظر کھڑی رہی اور وہ چناب کے اس کنارے کھڑا عزت بیگ بن کر اُسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اپنی آنکھوں کے سوا اُس کے قدموں تلے کیا بچھائے---

اچانک اُس کی نظر بپھرے ہوئے چناب کے دوسرے کنارے پر پڑی اور وہ پکار اٹھا "نہیں! نہیں! میں مہینوال نہیں بننا چاہتا۔"

اور اگلے دن اپنے دوست پٹوں کی ناراضگی کے باوجود وہ چک پندرہ میں منشی فضل دین کے ہاں منتقل ہو گیا۔

واڈھیوں کی چھٹیوں کے بعد سکول دوبارہ لگا تو شہر سے نصاب کی ساری کتابیں، شرحیں اور خلاصے خرید کر لے آیا۔ مصروفیت اتنی بڑھ گئی کہ اسے دُنیا جہان کا ہوش نہ رہا۔ وہ سکول میں بھی جی لگا کر کام کرتا۔ گندے مندے بچوں سے اُس کی نفرت بتدریج کم ہونے لگی اور ایک دن اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے دل میں ان بچوں کے ساتھ پیار کا بیج پھُوٹنے والا ہے تو وہ ڈر گیا۔ "نہیں! نہیں! میں اس بیج کو پھُوٹنے نہیں دوں گا مبادا یہ نشوونما پا کر سایہ دار درخت بن جائے۔"

ایک دن اُسے اچانک محسوس ہوا کہ اُسے پڑھانے میں لطف آ رہا ہے تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ "میرے اندر کوئی استاد چھُپا بیٹھا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ جنم لے میں اس بیج کو بھی کچُل ڈالوں گا۔"

چنانچہ اُس نے واجبی سا کام شروع کر دیا کہ لڑکوں کو نقصان بھی نہ ہو اور اس کی انرجی بھی محفوظ رہے اور بچوں اور سکول کے ساتھ اُس کی جذباتی وابستگی قائم نہ ہو سکے۔ بی اے پاس کرنے کے بعد اس نے معلمی سے استعفٰی دے دیا اور بی ٹی کی بجائے ایم اے انگریزی میں داخلہ لے لیا اور ٹیوشنیں کر کے اپنا خرچ پورا کرتا

رہا۔ تحریک پاکستان سے اَس کی وابستگی زبانی کلامی رہی۔ عملی طور پر اس نے اپنے وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کے متعلق اَس کا روّیہ خاصا معروضی تھا۔ اَس نے تیسرے درجے میں ایم اے کیا ہی تھا کہ پاکستان وجود میں آگیا اور کالج انگریزی کے اساتذہ سے قریب قریب خالی ہو گئے' تب اَسے پاکستان کی افادیت کا احساس ہوا۔ اَسے فوری طور پر ایک کالج کی لیکچرر شپ مل گئی۔ اب اگر وہ کمزور دل اور دماغ کا آدمی ہوتا تو اسی پر قناعت کرلیتا لیکن اُس نے دن رات ایک کر کے مقابلے کا امتحان دیا اور کامیاب ہو گیا۔

ایک اعلیٰ و ارفع زندگی کا آغاز ہوا تو وہ اپنا ماضی یکسر بھُول گیا۔ اُس کی ساری توجہ ترقی کے مدارج طے کرنے پر مرکوز رہی۔ ملک و قوم سے محبت کا اظہار اَس کے پیشے کا ایک لازمی جزو تھا لیکن اگر وہ ہندوستان میں بھی ہوتا تو اسی قسم کے روّیے سے کام لیتا اور نظر اپنے ذاتی عروج پر رکھتا۔ اَس نے شادی بھی کی تو اس میں محبت نہیں صرف ذاتی عروج پیش نظر رہا۔ وہ جس محکمے میں بھی جاتا' وہاں کامیاب و کامران رہتا اور اَس کی دیانت و امانت کے ڈنکے بجتے رہے۔ اگرچہ حلال کی کمائی میں برکت ضرور ہوتی ہے مگر اتنی نہیں کہ بنگلوں اور کاروں تک رسائی حاصل کر لے۔ یہ معجزہ بھی اس کی ذات سے سرزد ہوا کہ ایک نہیں دو بنگلے اُس نے بنوائے اور ہر بچے کو اَس نے کار لے کر دی کیونکہ بچوں کی تعداد "دو" سے بڑھنے نہیں دی تھی---- پر اتنے عروج کے باوجود بھی اُسے کبھی کبھار افسوس ہوتا کہ اَس نے اے۔ ڈی۔ آئی شیخ صاحب کا مشورہ کیوں نہ مانا اور فوج میں کمیشن کیوں نہ لے لیا---

----O----

وہ کسی دورے کے سلسلے میں ایک نہر کے کنارے سروس روڈ پر سے گزر رہا تھا' پیدل نہیں ایک کار پر کہ اسے ایک پل نظر آیا جہاں ایک گدھے والا کھڑا تھا اور ایک بابو گدھے والے کی چھَٹ میں اپنا سوٹ کیس اور بستر رکھوا رہا تھا۔

بغیر کسی ارادے کے اس کے منہ سے نکل گیا "ڈرائیور! کار روکو۔۔۔"
ڈرائیور نے کار روک لی۔ اس نے سوچا کہ صاحب کوئی حاجت ضروریہ پوری کرنا چاہتے ہیں، لیکن جب صاحب دیر تک آنکھیں پُل پر جمائے اپنی سیٹ پر گُم صُم بیٹھے رہے تو اس نے پوچھا "صاحب جی چلوں؟" "نہیں ذرا پُل تک جاؤ اور پوچھ کر آؤ کہ وہ سڑک کہاں جاتی ہے؟"

"وہ کچی سڑک؟" ڈرائیور نے پوچھا؟

"ہاں! ہاں۔" اور اس بابو سے بھی پوچھ کے آنا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟"

"صاحب جی کون سا بابو؟"

"وہ جو گدھے کے پاس کھڑا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

ڈرائیور نے واپس آ کر بتایا "وہ سڑک چک نمبر پندرہ جاتی ہے اور وہ بابو وہاں سکول میں استاد لگ کر جا رہا ہے۔"

"مجھے چک پندرہ لے چلو۔"

ڈرائیور چند لمحے حیران پریشان رہا۔ پھر کار میں بیٹھ کر اس نے سٹیرنگ ہاتھ میں لیا۔ "صاحب جی! سڑک کچی ہے۔ دھول بہت اُڑے گی۔"

صاحب نے کار کے شیشے چڑھا لئے۔

جب وہ گدھے کے پاس سے گزرے تو گدھے والا اور بابو دونوں بہت حیران ہوئے اور دیر تک حیران رہے کیونکہ کار سے اُڑنے والی دھول نے انہیں بھوت بنا دیا تھا۔

جب وہ دھول اُڑاتے اور ہچکولے کھاتے چک پندرہ پہنچے تو صاحب نے کہا۔ "ڈرائیور! مجھے سکول لے چلو۔"

"سکول؟" ڈرائیور نے کہا۔ "کار کھڑی کر کے کسی سے پوچھ لوں۔"

"نہیں! ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر سکول آ جائے گا۔"

اب تو ڈرائیور کی حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

صاحب نے دیکھا کہ چک کی آبادی خاصی بڑھ گئی ہے۔ بہت سے نئے مکان تعمیر ہو چکے ہیں اور ان میں سے کچھ پکے بھی ہیں۔ ایک پکے مکان کے احاطے میں کار بھی کھڑی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ نمبردار مستقیم کا گھر ہو۔ سکول کے قریب اُس نے کار رکوا لی۔ اُس نے دیکھا کہ چار دیواری کے بچے کھچے آثار بھی مٹ چکے ہیں۔ سکول کی عمارت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا گویا سکول ابھی تک پرائمری درجے سے آگے نہیں بڑھا تھا۔

صحن میں اوکاں کا بوڑھا درخت اپنی جگہ پر کھڑا تھا البتہ اُس کا تنا کھوکھلا ہو چکا تھا اور سایہ بھی چھدرا پڑ گیا تھا۔ اُس کے نیچے نلکے کا پائپ موجود تھا لیکن ہینڈل غائب تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نلکا ایک عرصے سے نہیں چل رہا۔ اوکاں کے سائے میں جو بچے بیٹھے تھے، یا تو ان کے پھٹے پرانے ٹاٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے یا وہ بوریوں کے ٹکڑوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ ہر لڑکا اپنا اپنا بوریا گھر سے لایا ہے۔

کرسی پر بیٹھے ہوئے ماسٹر جی کھڑے ہو کر اُسے دیکھنے لگے اور کچھ بچے اُس کی کار کے قریب ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔

ابھی تک اُس نے اپنے ماضی کو اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دیا تھا۔ اچانک از خود ماضی اُمڈ آیا جیسے سیلاب نے بند توڑ دیا ہو۔ یہ ایک فلیش تھا لیکن اتنا بھرپور کہ اس کے حال پر چھا گیا۔ پنوں، اُس کا گدھا، سوہنی کمہارن، چناب کا دوسرا کنارہ کہ وہ مہینوال بننے سے ڈر گیا تھا اور چک نمبر پندرہ میں گزرا ہوا ایک سال--- یہ سب کچھ ایک لمحے میں بیت گیا۔

اُس نے ڈرائیور سے کہا "واپس چلو!"

کلراٹھی دھول کا ایک بگولا اٹھا اگرچہ شیشے چڑھے ہوئے تھے، پھر بھی حلق تک

اُس کا منہ کڑوا ہو گیا اور آنکھوں میں تلخی بھر گئی۔

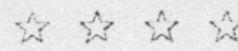
تب اَس کی آنکھوں سے کچھ آنسو ٹپکے جو کسی نے نہ دیکھے۔

کیا یہ آنسو ندامت کے آنسو تھے ؟ ندامت ! اس بات پر کہ وہ ایک کوٹھڑی سے نکل کر بنگلے میں پہنچ گیا تھا اور ایک تیز رفتار کار اسے اس سے بھی آگے کی منزل پر پہنچانے کے لئے مصروف سفر تھی اور دوسری طرف وہ سکول تھا' جہاں ایک قوم ایک نقطے پر ٹھہر گئی تھی' اس پرانے چھکڑے کی طرح کہ جس کے پہیئے کچی سڑک کی "گہل" سے نکل کر دُھول میں پھنس گئے ہوں اور کسی قوت والے بازوؤں کا انتظار کر رہے ہوں کہ جو انہیں پھر "گہل" میں ڈال دیں۔

اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کی پوری زندگی میں وہ لمحہ پھر سے نہ آسکا ہو جو اس نے پنوں کمہار کی دوستی میں بتایا تھا اور جسے اس نے سوہنی کمہارن کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ لیکن وہ مرزا عزت بیگ سے مہینوال نہ بن سکا تھا!

کون جانے !

(نومبر ۱۹۹۱ء)



اللہ ھُو... یوسفؑ کھُوہ

عشا کی نماز پڑھ کر جب وہ بستر پر دراز ہوا اور لحاف اوڑھا تو اس کا دل ذاکر ہو گیا۔

اللہ ہو !--- اللہ ہو!--- اللہ ہوَ !

اس کا پلنگ دیوار کے ساتھ اس طرح بچھا تھا کہ سوئچ بورڈ تک اس کا ہاتھ آسانی سے پہنچ سکے۔ اس نے ٹیوب کا سوئچ آف کیا تو اندھیرا لپک کر آیا۔ پھر اس نے زیرو کا بلب جلایا تو ہلکی ہلکی روشنی اندھیرے میں رچنے لگی اور در و دیوار کے ہیولے آہستہ آہستہ اندھیرے سے برآمد ہونے لگے۔ تب لحاف کی نرمی میں اس کے جسم کی گرمی رچنے لگی۔ لحاف کہیں ٹھنڈا تھا اور کہیں ہلکا گرم۔ پاؤں اس کے جرابوں میں تھے۔ پائنتی کے یخ ٹھنڈے لحاف کے لمس نے اُسے عجیب سی راحت سے ہم کنار کیا۔

بوڑھے جسم میں اتنی گرمی کہاں ہوتی ہے کہ لحاف چند لمحوں کے اندر گرم ہو جائے اور جسم بھی وہ جو ابھی ابھی شدید خشک سردی کے باعث پھیلے ہوئے فلُو' نزلے' بلغم اور بخار کے حملے سے جانبر ہوا ہو اور اینٹی بائی آٹک کے استعمال سے جس کے وہ خُلیے مردہ ہو چکے ہوں جو سردی کا مقابلہ کرتے ہیں اور نتیجے میں طبیعت کو مسرت' بشاشت' بہجت اور کشادگی عطا کرتے ہیں۔ ابھی تو اس کا ذائقہ بھی بحال نہیں ہوا تھا۔ نمک کا' نہ مرچ کا۔ مٹھاس کا' نہ تلخی کا۔ حتیٰ کہ ادب کا ذائقہ بھی مردہ ہو چکا تھا۔ فلو کے حملے سے ایک دن پہلے اس کے افسانوں کا ایک مجموعہ چھپا تھا جس کی اشاعت کا اسے بہت انتظار تھا۔ یہ مجموعہ اس کے سرہانے کی میز پر پڑا تھا اور اس کا جی نہیں چاہتا

تھا کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔

عشا کی نماز بھی اس نے جسم کی مرضی کے خلاف پڑھی تھی۔ رکوع و سجود میں اس کے گھٹنے چٹختے رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں' کیا تمہاری روح یہ نماز ادا نہیں کر سکتی تھی۔ بستر کی نرمی و گرمی میں جسم کو راحت ملے تو کیا اس سے روح مُردہ ہو جاتی ہے؟ نہیں--- بیماری کے دوران اسے جسم کی بات ماننی پڑی تھی۔ اب افاقہ ہوا تو اس نے جسم کے احتجاج کو رد کر دیا۔

نماز ادا ہو گئی تھی لیکن اسے روحانی سرور نہیں ملا تھا' روحانی سرور کی بھی ایک ہی کہی۔

اس نے اپنے آپ سے پوچھا "کسی ایسی نماز کا پتا دے سکتے ہو جس سے تمہیں روحانی سرور ملا؟ تمہارا جسم مصلے پر ہوتا ہے اور تم سمرقند و بخارا میں' نہیں چیچو کی ملیاں اور چوہڑ کانے میں۔" بابا نانک نے سلطان پور کے نواب کے اصرار سے مجبور ہو کر ان کے ساتھ دو رکعتیں پڑھیں اور پھر صف سے الگ ہو کر بیٹھ گئے۔

نواب نے پوچھا "نانک! تم نے نماز بھی پوری نہ کی؟"

"حضور! میں نماز کس کے ساتھ پوری کرتا' امام صاحب کی گائے کھونٹے سے کھل گئی تھی اور وہ اس کے پیچھے پیچھے مارے مارے پھر رہے تھے اور آپ غزنی اور ہرات میں گھوڑے خریدنے چلے گئے تھے۔"

اسے یاد آیا' کبھی کبھار جوانی میں اسے ایسی نماز مل جایا کرتی تھی' جب جسم اور روح یکجا ہو جاتے تھے۔ پھر مکروہاتِ زمانہ نے جسم اور روح کے درمیان ایسا فاصلہ ڈالا کہ سنگم اور اتصال کا یہ نقطہ پھر کبھی نہ آیا۔

جب وہ بی اے کی تیاری کر رہا تھا' تو وہ بے خوابی کی بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ جب وہ بستر پر دراز ہوتا تو دیر تک شیپ سلیپ۔ شیپ سلیپ (Sheep Sleep) والا نسخہ آزماتا۔ سینکڑوں بھیڑیں شمار کرنے کے بعد بھی وہ نیند تو کیا نیند سے پہلے والی

غنودگی بھی اپنے آپ پر طاری نہ کر سکتا۔

اس نے اپنے والدِ مرحوم سے ذکر کیا تو وہ کہنے لگے "بھیڑیں بکریاں گننے کی بجائے "اللہ ہُو" کا ورد کیا کرو۔ تکیے پر سر رکھ کر جب تمہیں ریلیک سیشن (Relaxation) کا احساس ہو تو دل کی طرف دھیان کر کے سانس کو اندر کھینچ کر "اللہ" کہو' پھر جب سانس خارج ہو تو "ہُو" کہو"۔ اس نے یہ نسخہ آزمایا اور کامیاب پایا۔ ورد کے دوران پہلے غنودگی کی کیفیت طاری ہوتی تھی اور یہ کتنی عمیق کیفیت تھی کہ اس میں زمان و مکاں گم ہو جاتے۔ اسی کیفیت میں ایک بار اس نے دیکھا کہ اس کے دل کی سیاہ زمین پر سفیدی میں اللہ کا لفظ لکھا گیا ہے اور پھر ایک بار بڑی گہری نیند سے اچانک اس کی آنکھ کھُل گئی تو اس کے کانوں نے سنا کہ کوئی "اللہ ہُو" کا ورد کر رہا ہے۔ وہ چونک گیا اور چند لمحوں تک حیران پریشان رہا۔

تب اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کا قلب ذاکر ہو گیا ہے۔ اس کے والد مرحوم نے کہا "اب تمہارے لئے دو ہی راستے ہیں۔ کسی درویش کی بیعت کرو اور چلے کاٹو لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم ایک بیوی اور ایک بچے کے کفیل بھی ہو اور دوسرا راستہ پیغمبری راستہ ہے' دنیا بھی رکھو اور دین بھی اور یہ راستہ بہت کٹھن ہے۔"

اس ضمن میں انہوں نے دو مثالیں دیں۔ ایک مثال تو داتا گنج بخش علیہ الرحمتہ کی تھی کہ انہوں نے نکاح کیا' صرف سنتِ پیغمبر کی تعمیل میں۔ کہا کہ نبیؐ کی اس سنت کو طوق بنا کر گلے میں ڈالنا پڑا اور دوسری مثال گوسوامی رام تیرتھ کی تھی کہ جن کے لیکچروں کا ایک مجموعہ ان کے ایک ہندو دوست جو ویدانتی تھے' انہیں پڑھنے کے لئے دے گئے تھے۔ انہوں نے یہ کتاب اسے دے کر کہا۔ "اس میں گوسوامی جی کے حالات پڑھو۔"

گوسوامی جی ریاضی میں ایم۔ اے تھے۔ کچھ عرصے تک ایک کالج میں پڑھاتے

رہے تھے۔ پھر دنیا ترک کر دی حالانکہ بچپن کی شادی کی وجہ سے بال بچوں والے تھے۔ بہت بڑی روحانی قوتوں کے مالک تھے۔ جنگل میں سمادھی لگا کر بیٹھتے تو شیر، چیتے، بھیڑئے اور ہرن ان کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ جاتے۔ انتیس سال کی عمر میں ان کا گنگا میں ڈوب کر دیہانت ہو گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے خود کشی کر لی۔ کیا پتا وہ اپنی روحانی ممکنات کی انتہا پر پہنچ چکے ہوں اور مزید زندگی کو بے فائدہ جانتے ہوں۔

چنانچہ اس نے ایک عام انسان کی زندگی کو چُن لیا کیونکہ اسی میں عافیت تھی۔ اگرچہ وہ پیغمبرؑ اور امامؑ کی طرح دین و دنیا میں توازن قائم نہ کر سکا تاہم اس نے ایک ایسے انسان کی زندگی گزاری جسے شُودریا میں تختہ بند کر کے موجوں کے سپرد کر دیا گیا تھا اور پھر بھی اس سے تقاضا تھا کہ دامن تر نہ ہونے دینا۔ وہ تر دامن بھی ہوا اور اس کی تردامنی سے کسی فرشتے نے وضو بھی نہ کیا۔

تاہم "اللہ ہو" والی عادت اسے نہ بھُولی۔

تکیے پر سر رکھتے ہی یہ ورد شروع ہو جاتا۔ گرمیوں کی راتوں میں جب وہ باہر سوتا، تو ورد کرتے ہوئے اس کا دھیان آسمان کی طرف اٹھ جاتا۔ جب قصبوں اور دیہات میں بجلی نہیں آئی تھی تو "اللہ ہُو" کی ایک ایک ضرب کے ساتھ آسمان پر تارے کھلتے چلے جاتے اور اس پر غنودگی چھا جاتی۔

اور آج رات جب اندھیرے میں گلابی روشنی رچی اور اس پر غنودگی کی لذت آمیز کیفیت طاری ہوئی، تو "اللہ ہُو" کی پہلی ضرب کے بعد، اس کے کان میں کسی نے سرگوشی کی "یوسفؑ کھوہ۔"

اور غنودگی کا گلابی پردہ چاک ہو گیا۔

اور شدید خوشی کا ایک لمحہ اس کے دل میں اتر آیا۔

جیسے اچانک شبنم کا کوئی قطرہ ٹپک گیا ہو۔

اس لمحے میں بجلی کے ایک کوندے کی لپک ضرور تھی لیکن وہ طُور پر لپکنے والا

بجلی کا کوندا نہیں تھا کہ جسم و جان ریزہ ریزہ ہو جاتے۔

اتنی خوشی اسے اس سے پہلے صرف ایک بار نصیب ہوئی تھی لیکن یہ دوسری کہانی ہے جس کا ربط اس کہانی سے قائم نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وہ بھی عبادت کا ہی ایک لمحہ تھا۔

اتنی خوشی کہ جسم لطیف ہو کر اس میں سما گیا۔

اور لطافت کثافت پر غالب آ گئی۔

تب آنا" فانا" نیند آئی اور اس کے جسم و جان پر طاری ہو گئی۔

نہ جانے نیند کی کس منزل پر اس نے ایک دریچے کو دیکھا جو بستہ سر کے نیچے رکھ کر ایک کیکری کی چھدری چھاؤں تلے لیٹا ہوا تھا۔

اس نے اپنے آپ سے پوچھا "یہ بچہ کون ہے؟"

اس نے سوچا "ہو سکتا ہے کہ یہ میرا پوتا ہو جو سکول سے واپسی پر چھدری چھاؤں تلے سو گیا ہو جب کہ چھاؤں سے باہر دھوپ بہت تیز ہے اور کچی سڑک پر تیز دھوپ کے لہریے اور ننھے ننھے بگولے اٹھ رہے ہیں اور بچے کا چہرہ پسینے میں تر ہے اور کیکری سے ذرا آگے شیشم کا درخت ہے کہ جس کا سایہ بہت گھنا ہے۔ میں اسے اٹھا کر گھنے سائے میں کیوں نہ لے جاؤں۔"

اور عین اس لمحے کیکری کی شاخ پر بیٹھی ایک فاختہ بولی۔

"گھگو گو۔"

اور اس بچے کے منہ سے سوئی سوئی آواز نکلی۔

"یوسف ؑ کھوہ۔"

جب آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں وا ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ شبنم سے دُھلی ہوئی مسرت کا ایک لمحہ ان آنکھوں میں صبح کا ستارہ بن کر چمک رہا ہے۔

جب اس بچے نے کُرتے کے دامن سے اپنا چہرہ پونچھا تو اسے یہ چہرہ شناسا سا

نظر آیا۔ تب اسے یاد آیا کہ اس بچے کو فاختہ کی کوکو سے بہت پیار تھا جسے اس کی ماں نے بتایا تھا کہ فاختہ "گھگوگو" نہیں، "اللہ ہو--- یوسفؑ کھُوہ۔" کہتی ہے کہ یوسفؑ جو پیغمبر زادہ تھا، اسے بھائیوں نے گہرے کنویں میں پھینک دیا تھا، جبھی تو فاختہ کی آواز میں اتنا دکھ ہوتا ہے۔

اور یہ بچہ گرمیوں کی ہر دوپہر کو سکول سے واپسی پر اس کیکری کی چھدری چھاؤں تلے سو جایا کرتا تھا کہ فاختہ کی "اللہ ہُو" سن کر اس کا جواب دے سکے! "یوسفؑ کھُوہ!"

تب اس کی آنکھ کھل گئی!

اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور اس کا قلب ذکر میں مصروف تھا۔

اور "اللہ ہُو" کی ہر ضرب کے بعد غیب سے "یوسفؑ کھُوہ" کی آواز آ رہی تھی۔

(جنوری ۱۹۹۲ء)

☆ ☆ ☆ ☆

گُڑ کی ڈَلی

جب تک وہ تین کِلے زمین کا مالک تھا' وہ چودھری تھا۔ اب اسے کوئی چودھری کہہ کر پکارتا تو وہ حیران ہو کر سوچتا کہ کسے پکارا جا رہا ہے۔

وہ کہتا "یارو! مجھے چودھری نہ کہا کرو' بلاشک میں کبھی چودھری شاہ محمد تھا' پر اب شاہو مزدور ہوں۔"

ایک وسیع رقبے میں ایک بہت بڑی عمارت زیر تعمیر تھی جہاں سینکڑوں مزدور کام کر رہے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ یہاں ایک بہت بڑی مِل لگے گی جس سے علاقے کے ہزاروں آدمیوں کو روزی ملے گی۔ یہ بہت اچھی بات تھی۔ اس علاقے میں جگہ جگہ ایسی ہی کئی اور ملیں بھی لگ رہی تھیں اور رہائشی کالونیاں بن رہی تھیں۔ کبھی اس علاقے میں ہری بھری فصلیں لہلہاتی تھیں اور کئی گاؤں آباد تھے۔

گاؤں تو اب بھی موجود تھے اور برباد بھی نہیں تھے لیکن چونکہ اردگرد کھیتوں میں فصلوں کی بجائے کھمبے اور عمارتیں اُگ رہی تھیں' اس لئے انہیں آباد بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ شہروں کی رونق پکی سڑکوں اور اونچی اونچی عمارتوں سے ہے لیکن دیہات کی چہل پہل تو فصلوں اور درختوں' پرندوں اور ڈھور ڈنگروں سے ہوتی ہے۔ ڈھور ڈنگر تو دیہات کی زینت ہوتے ہیں۔ ان کے گلوں میں گھنگرو بندھے ہوں تو ڈیروں سے چراگاہوں میں جانے اور چراگاہوں سے ڈیروں کی طرف لوٹتے وقت دیہات کی فضاؤں میں نغمے بکھر جاتے ہیں اور کبھی کبھار انہیں فضاؤں میں کسی رانجھے کی ونجلی کے میٹھے بول بھی سنائی دے جاتے ہیں۔

دُور دُور تک کھیت اجڑ گئے تھے۔ جہاں کبھی گندم' کماد' مکی اور چاول کی کاشت ہوتی تھی' وہاں اب جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔ درخت بھی کٹ چکے تھے۔ اب کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی کیکریاں رہ گئی تھیں۔ درخت تو اُس وقت کٹ گئے تھے' جب لوگوں کو معلوم ہوا تھا کہ اس علاقے کی زمینیں ان سے خرید لی جائیں گی۔ مینڈھیں درختوں سے خالی ہوئیں تو پرندے بھی اُڑ گئے' زمین میں ہل نہ چلا تو وہ سرسبزی سے محروم ہو گئی۔ سُوکھی سڑی جھاڑیوں میں آک کے پودے اُگ آئے۔ آک کا سبز رنگ نہایت بیمار سا نظر آتا ہے کہ آنکھوں کو طروات نہیں بخشتا۔ چونکہ اس علاقے میں بارش کم ہوتی تھی' ٹیوب ویل اجڑ گئے تھے اور نہر کا پانی بند کر دیا گیا تھا' اس لئے گھاس پر بھی وہ رونق نہ آتی کہ جس پر سبز مخمل کے فرش کا گمان گزرے۔ گھاس بہت جلد سُوکھ جاتی۔

شاہ محمد حیران ہوتا کہ جب تک ملیں نہیں لگتیں اور کالونیاں آباد نہیں ہوتیں' یہاں سبزیاں لگائی جا سکتی تھیں' گندم کاشت ہو سکتی تھی' کماد اگایا جا سکتا تھا' برسیم اور شٹالہ بو کر زمین کا ننگ ڈھانپا جا سکتا تھا۔ اللہ کی زمین کے ایک زرخیز ٹکڑے کو بنجر بنا کر خلق خدا کو اناج کے ایک بہت بڑے ذخیرے سے محروم کرنے کا بھلا کیا فائدہ تھا؟ ہم لوگ مزدور بننے کی بجائے مزارع بن کر کام کرتے اور زمین سے ہمارا ناتہ نہ ٹوٹتا۔

وہ صنعت کار جس کی یہاں سب سے بڑی مل لگ رہی تھی اور جہاں شاہ محمد مزدوری کر رہا تھا' اسے شاید زمین سے پیار تھا کہ اس نے آٹھ دس مربعے کا زرعی فارم بنا لیا تھا۔ ہرا بھرا فارم جو ریگستان میں نخلستان کا منظر پیش کرتا تھا۔

صنعت کار کو شاید زمین سے تو اتنا پیار نہیں ہوتا جتنا زمیندار کہلانے کا شوق ہوتا ہے۔ وہ دیہات میں زمین خرید کر وہاں نئی طرز کی حویلی تعمیر کرتے ہیں۔ یہ حویلی اکثر بند رہتی ہے۔ سال میں ایک دو بار یہ لوگ گاؤں ضرور آتے۔ ان کے نوجوان بندوقیں کندھوں پر لئے دیہات کے پرندوں کا قتل عام کرتے اور ان کے بڑے بوڑھے

خاندانی زمینداروں کی طرح مزارعوں اور کارندوں کی محفل لگاتے' ان کی شکایتیں سنتے' چھوٹے موٹے جھگڑوں کا فیصلہ بھی کرتے' کئیوں کو انعام اکرام بھی دیتے۔ ان کی جوان عورتیں گاؤں کی گلیوں میں سے گزرتیں تو نخروں اور نزاکتوں کے ساتھ عطر پھلیل کی خوشبو بھی بکھیرتی جاتیں۔ دیہاتی نوجوان بھی بودے سنوار کر انہیں حسرت کی نگاہوں سے دیکھتے اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے اور شہری نوجوان دیہات کی صحت مند مٹیاروں کو تاڑتے اور رال ٹپکاتے۔

سابقہ چودھری اور حالیہ مزدور شاہ محمد کا خیال تھا کہ گاؤں کے دکاندار اور شہر کے ساہوکار اور سیٹھ کو "کاشتکار" کہلانے کا بہت شوق ہے۔ کیوں؟ اس کا جواب شاہ محمد کو معلوم نہیں تھا۔ اُسے کیا پتہ کہ چالاک انگریز نے پنجاب اور سندھ کو غلے کا ذخیرہ بنانے کے لئے ان کے عوام کو دو طبقوں میں بانٹ دیا تھا' کاشتکار اور غیر کاشتکار۔ ہر وہ آدمی جو کاشتکاری نہیں کرتا تھا' کمیں کمین کہلاتا تھا۔ موچی' نائی' لوہار' ترکھان' دھوبی اور گاؤں کا دکاندار بھی کہ اکثر دیہاتی اس کے مقروض ہوتے اور ان کی زمینیں اس کے پاس رہن ہوتیں لیکن وہ اپنے آپ کو "کاشتکار" نہیں کہلوا سکتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بظاہر یہ تمیز اُٹھ گئی لیکن یہ دیہات کی سائیکی یا اجتماعی لاشعور کا ایک مستقل حصہ بن چکی ہے اور ساہوکار یا صنعت کار کے لاشعور میں شدید احساسِ کمتری بن کر سما چکی ہے۔

شاہ محمد سوچتا جب میں تین کلّوں کا مالک تھا تو علاقے کا راٹھ تھا۔ میں فصل اُگاتا اور سال میں دو بار موچی' نائی' لوہار اور ترکھان کو سیپ دیتا۔ کھلیان تیار ہوتا تو میرا دل بادشاہ ہوتا۔ میراثی' بھرائیں' ڈوم' ڈھاری' ڈھول بجانے والے شیخ' فقیر فقرے آتے اور مجھ سے کچھ نہ کچھ ضرور لے جاتے۔ یہ اور بات ہے کہ دے دلا کر مجھے سال بھر کے دانے بھی نہ بچتے۔ ٹیوب ویل اور ٹریکٹر کے آنے سے کمیں کمین مجھ سے کہیں آگے نکل گئے اور سیپ والا رشتہ ان سے ٹوٹ گیا پر وہ میری طرح دل کے غنی

نہ ہوئے۔ کوئی نہ کوئی میرے ڈیرے پر ضرور آتا اور کہتا "چودھری! بھینس کے لئے تھوڑا سا شٹالا چاہیے۔" میں دُور سے کھیت کی طرف اشارہ کر کے کہتا "جا وہاں سے کاٹ لے۔" یا اور کچھ نہیں تو کوئی گنا ٹوٹا یا چھلی تکا ہی مانگ کر لے جاتا۔ اب میری زمین ہی نہیں رہی تو کوئی میرے پاس کیوں آئے؟ میں گائے بھینس بھی نہیں رکھ سکتا کہ چارا خرید کر انہیں پالنے کی توفیق نہیں رہی۔ دودھ، گھی، لسی اور دہی کا مزہ بھی بھول چکا ہوں۔

زمین کے بکنے سے اُسے اچھی خاصی رقم ملی تھی۔ اُس نے کچا مکان ڈھا کر پکا بنایا، ایک بیٹے اور دو بیٹیوں کی شادیاں بھی دُھوم دھام سے کیں۔ اس علاقے میں بجلی آئی تو اُس نے بجلی بھی لگا لی۔ لالٹین کی جگہ بجلی کا بلب جلا تو گھر میں اُجالا ہی اُجالا نظر آیا۔ اپنے گاؤں کے دکاندار کے کہنے پر بچی کھچی رقم ایک کواپریٹو کارپوریشن میں لگا دی۔ اس سے جو منافع ملتا تھا، اس سے گزر بسر آسانی سے ہونے لگی۔ پھر اچانک ایک بلبلہ پھٹا اور اُس کی رقم ایک گہرے سمندر میں ڈوب گئی۔ دو چار مہینے شور و غوغا ہوا۔ کارپوریشنوں کے بند دروازہ کے سامنے لوگ دھرنا مار کر بیٹھے۔ دو چار نے بھوک ہڑتال بھی کی۔ کچھ اچھی قسمت والوں کو تھوڑی بہت رقم واپس بھی ملی۔ پھر خاموشی چھا گئی اور اسی کے ساتھ گھُپ اندھیرا بھی کہ اس کے پاس بجلی کا بِل دینے کو پیسے نہ رہے اور بلب بجھا دیا گیا۔

تب اُس نے اللہ کا نام لیا اور اس بڑی عمارت میں جو ایک بہت بڑی مِل کے لئے بن رہی تھی، مزدوری کر لی۔ مزدوری میں عزت کو بٹا نہیں لگتا لیکن کھیتی کے بعد مزدوری ایسی ہی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی گندم کی روٹی کی بجائے جو کی روٹی کھانے پر مجبور ہو جائے کہ جس کا ہر لقمہ گلے میں پھنستا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کھیتی اپنے لئے کی جاتی اور اپنا کام اپنا ہی ہوتا ہے۔ وہ پسینہ جو اپنے لئے بہایا جائے وہ مٹی کے لئے کھاد بن جاتا ہے اور جو پسینہ کسی اور کے لئے بہایا جائے، وہ مٹی کے لئے کلّر بن جاتا ہے

کہ جس سے کوئی کونپل نہیں پھوٹتی۔ ہر فصل پر کسان نیا جنم لیتا ہے، فصل کے بچپن کے ساتھ اس کا بچپن گزرتا ہے اور جب فصل جوان ہوتی ہے تو وہ بھی جوان ہو جاتا ہے اور فصل جب پھل پھول دیتی ہے تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ یہ پھل پھول اس کی جوانی کو لگے ہیں اور جب فصل پک کر درانتی کا انتظار کر رہی ہوتی ہے تو وہ یہی جانتا ہے کہ اس کی حیاتی کا ایک چکر پورا ہونے والا ہے۔

ابھی اُسے کام کرتے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ اس عمارت کے مالک معائنے کے لئے تشریف لائے۔ سفید خشخشی داڑھی، سفید شلوار قمیص اور سفید نورانی چہرہ۔ ایسے لگا جیسے ابھی ابھی آب زم زم سے دھل کر آئے ہیں۔ آتے ہی مزدوروں میں گھُل مِل گئے۔ بندہ و آقا کا امتیاز مِٹ گیا۔ شاہ محمد سے بھی انہوں نے خیرخیریت پوچھی۔ جب کچھ مزدور کام چھوڑ کر اُن کے گرد جمع ہو گئے تو فرمانے لگے "اللہ کے بندو! جاؤ اپنا اپنا کام کرو۔ کام ہی میں برکت ہے۔ سمجھو یہ عمارت بھی تمہاری ہے اور اس میں جو مل لگے گی، وہ بھی تمہاری ہے۔ اس سے علاقے کی خوشحالی میں اضافہ ہو گا اور تمہیں روزگار ملے گا۔"

شاہ محمد اُن کی شخصیت اور گفتگو سے بہت متاثر ہوا۔ سوچنے لگا، ابھی اس دنیا میں ایسے اللہ کے بندے بھی موجود ہیں--- کہ سرفراز آ گیا۔ سرفراز نوجوان تھا۔ ایف۔ اے تک پڑھا ہوا تھا اور ٹھیکیدار کی طرف سے مزدوروں کے کام کی نگرانی پر مقرر تھا۔ اس نے پوچھا۔ "چودھری شاہ محمد! کیا سوچ رہے ہو؟"

"دیکھو منشی! میں نے تمہیں کئی بار روکا ہے کہ مجھے چودھری نہ کہا کرو۔"

"اچھا چاچا! یہ بتا کہ تو کیا سوچ رہا ہے؟"

"یہی کہ اتنا بڑا آدمی اور اس میں غرور نام کو نہیں۔"

سرفراز نے مسکرا کر پوچھا۔ "چاچا! جس کواپریٹو کارپوریشن میں تمہاری رقم ڈوب گئی ہے، جانتے ہو اس کا مالک کون ہے؟"

"نہیں تو۔" شاہ محمد بولا۔

"یہی بڑا آدمی۔"

"لیکن میں نے تو کسی اور کا نام سنا تھا اور یہ بھی سنا تھا کہ وہ جیل میں ہے۔"

"چاچا! وہ اس کا چھوٹا پارٹنر ہے۔ مطلب ہے' چھوٹے حصے کا مالک۔ بڑے آدمی اپنے ساتھ چھوٹے آدمی بھی رکھتے ہیں جو ان کے لئے جیل چلے جاتے ہیں۔" سرفراز نے کہا۔

شاہ محمد دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اُس نے پوچھا۔ "منشی! ہماری ڈوبی ہوئی رقم ہمیں مل جائے گی؟"

"مل تو رہی ہے؟" سرفراز نے کہا۔

"مل رہی ہے؟" شاہ محمد کے استفسار میں حیرت تھی۔

"قسطوں میں--- ہر روز--- شام کو جب تم کام سے فارغ ہوتے ہو' تو کیا تمہیں پسینہ خشک ہونے سے پہلے ساٹھ روپے نہیں ملتے؟"

"ملتے ہیں۔" شاہ محمد نے کہا۔

"یہ اُسی ڈوبی ہوئی رقم کی قسط تو ہے۔"

"منشی! تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ ایسا مذاق اچھا نہیں ہوتا۔"

"نہیں چاچا! تم میرے بزرگ ہو۔ میں تمہیں مذاق کر سکتا ہوں کیا؟"

شاہ محمد کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ سرفرار کی بات کو مذاق سمجھے لیکن اُس کا دماغ کہہ رہا تھا کہ یہ مذاق نہیں' سچ ہے--- نہیں مذاق ہے--- سچ ہے--- نہیں مذاق ہے--- اُس کے قلب و ذہن میں دیر تک یہ کشمکش رہی تو سرفرار نے اُس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا "چاچا! آؤ تمہیں فارم میں لے چلوں۔ وہاں تمہارا جی بہل جائے گا۔"

"ابھی یا چھٹی ہونے پر؟"

"چھٹی ہونے پر ہی بہتر رہے گا۔" سرفرار نے کہا۔

چھٹی ہونے پر شاہ محمد نے اپنی مزدوری لی اور سرفراز کے ساتھ فارم پر پہنچا۔ کیا ہرا بھرا فارم تھا۔ کھیتوں میں اتنی ہریاول تھی کہ آنکھیں میں طراوت آگئی اور دن بھر کی تھکاوٹ جاتی رہی۔ ٹیوب ویل پھک پھک چل رہا تھا اور کھال میں بہتا ہوا پانی سونے کی لکیر لگ رہا تھا۔ کھیتوں میں کتنی ترتیب تھی اور ان کے درمیان راستے کتنے سیدھے تھے اور ان کے کناروں پر راست قد پاپلر ایک دوسرے سے برابر فاصلے پر کھڑے تھے۔ کماد کے پودوں پر بھی کیا جوانی آئی ہوئی تھی۔ ایک جیسے قد اور ایک جیسا فاصلہ۔ ایک ایک گنا گنا جا سکتا تھا۔

شاہ محمد کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ فارم کے ایک کونے میں مشینی بیلن چل رہا ہے اور گنے کا رس ایک ڈرم میں جمع ہو رہا ہے۔ پاس ہی ایک بہت بڑا ''چنبا'' روشن ہے اور اس پر رکھے کڑاہ میں رس ابل کر گڑ کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ گرم گرم گڑ کی خوشبو اس کے نتھنوں میں گھس آئی تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اپنے ندیدے پن پر اسے بڑی شرم آئی۔ وہ وہاں سے ٹل گیا۔

اتنے میں فارم میں میلہ سا لگ گیا۔ بھانت بھانت کے لوگ جمع ہو گئے۔ فقیر فقرے۔ لولے لنگڑے۔ اندھے کانے۔ اردگرد کے دیہات کے بچوں کی تو بھیڑ لگ گئی۔ اس بھیڑ میں بوڑھے بھی شامل تھے اور جوان بھی۔ بستی واسیوں کی جوان جہان لڑکیاں بھی گھوم پھر رہی تھیں اور جوان لڑکے ان سے چھیڑچھاڑ بھی کر رہے تھے۔ میراثی، ڈوم ڈھاری، بھرائیں، ڈھول بجانے والے شیخ بھی وہاں موجود تھے۔ جب بڑے صاحب کوٹھی کے کمرے سے نکل کر برآمدے کی سیڑھیوں پر آ کھڑے ہوئے تو لوگوں نے بڑے والہانہ انداز میں ان کا استقبال کیا۔ ان کے اشارے پر خیرات بٹنے لگی۔ بچوں کو ایک ایک روپیہ، بڑوں میں کسی کو پانچ کا نوٹ ملا، کسی کو دس کا۔ ایک دو معذور عورتوں کو پچاس پچاس کا نوٹ بھی ملا۔ میراثی، بھرائیں، شیخ اور ڈوم ڈھاری سبھی فیض یاب ہوئے۔ سب انہیں دعائیں دے رہے تھے اور میراثی تو بڑے صاحب کے گن گا

رہا تھا کہ اسے سو کا نوٹ ملا تھا۔

تب بڑے صاحب کے ایک معتبر کارندے نے اعلان کیا کہ اب تم سب گیٹ پر پہنچ جاؤ۔ وہاں ایک آدمی گڑ تقسیم کر رہا تھا۔ ہر آدمی کو ایک ایک ڈلی دی جا رہی تھی۔ بڑے صاحب پاس کھڑے اس منظر کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ نورانی چہرے پر فرشتوں کا سا اطمینان تھا۔ جب شاہ محمد گیٹ میں سے گزرنے لگا تو کارندے نے ایک ڈلی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ ڈلی سے سونف اور دیسی گھی کی خوشبو آ رہی تھی' اس سے کھوپے کی دو چار نہایت سفید قاشیں چمٹی ہوئی تھیں' ایک بادام کا کونہ بھی ابھرا ہوا نظر آ رہا تھا اور ایک دو کشمش کے دانے بھی۔

گڑ کی ڈلی نے اس کی بھوک کو تیز کر دیا۔ وہ اسے منہ تک لے ہی گیا تھا کہ اچانک اسے اپنا پرانا زمانہ یاد آ گیا۔ وہ اپنی چھوٹی سی کھیتی میں دو چار کنال زمین کماد کے لئے الگ کر دیا کرتا تھا۔ بچوں کو چوسنے کے لئے گنا مل جاتا' اپنے موسم میں کماد کٹتا اور چھلتا' بیلن چلتا' رس گھڑوں میں جمع ہوتا' ایک دو گھڑے کھیر کے لئے گھر بھیج دیئے جاتے' "چنبیے" میں آگ جلائی جاتی اور کڑاہ میں گھڑے بھر بھر کر رس انڈیلا جاتا' رس ابلتا تو اس کی خوشبو دور دور تک پھیل جاتی اور راہ چلتے لوگوں کو کھینچ لاتی۔ کچھ راہی پینڈا کھوٹا کر کے "چُنبیے" کے گرد آ بیٹھتے' آگ تاپتے' رس پیتے اور جونہی "گند" میں ابلتا' بل کھاتا رس انڈیلا جاتا اور وہ گاڑھا ہو کر گڑ بنتا' پھر تو لوگوں کی رال ٹپکنے لگتی۔ "رنبے" سے گرم گرم گڑ نکالا جاتا اور پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھا جاتا۔ کئی بار ہتھیلی جل جاتی پر مجال ہے' کوئی اف کرتا ہو۔ میراثی گرم گرم گڑ کھا کر کہتا "چودھری! تیرا سدا گڑ میں رنبا رہے۔"

گرم گرم گڑ کا بھی اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ ادھر زبان پر رکھو' اُدھر گھل جائے۔ سیانے کہا کرتے تھے کہ گڑ بدن کا ایندھن ہوتا ہے اور خوراک کو ہضم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ گرم گرم گڑ میں تو طاقت بھی بہت ہوتی ہے۔ ایک دو "دھور" گری میوے

والے گڑ کے بھی نکالے جاتے۔ باداموں کی توفیق نہ ہوتی تو مونگ پھلی سے کام چلایا جاتا، کوئی دھی بہن میکے سے سسرال جاتی تو اس کے پلو میں سیر دو سیر گڑ کی ڈلیاں باندھ دی جاتیں۔

جب کھیت آباد تھے تو اپنے موسم پر ایسے کئی "چنبے" اس علاقے میں جلتے تھے۔ اب وہ سب بجھ گئے ہیں اور صرف ایک "چنبا" جل رہا ہے اور وہاں گری میوے والا گڑ بنایا جا رہا ہے۔ اس سوچ پر وہ پہلے بہت مغموم ہوا، اتنا مغموم کہ اس کے گلے میں پھندے لگ گئے۔ پھر اچانک غم غصے میں بدل گیا اور غصہ بھی اتنا سخت کہ ڈلی اس کی مٹھی میں لوہے کی طرح تپنے لگی۔ اس نے ڈلی کو دور گرد میں پھینک دیا۔ اب غصہ جلتے چھنکتے آنسوؤں کی صورت میں بہہ نکلا۔

ایک ساتھی مزدود نے اسے ڈلی پھینکتے ہوئے دیکھا تو پہلے بہت حیران ہوا۔ پھر اس کی آنکھ بچا کر لپکا اور ڈلی اٹھالی، صافے کے پلو سے اس کی گرد جھاڑی اور اس میں دانت گاڑ دیئے!

(فروری ۱۹۹۲ء)

☆ ☆ ☆ ☆

ماسی حاجن اور چوہا چور

ماسی حاجن اور چوہا چور ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ان کے اصل ناموں کی اس کہانی میں کوئی اہمیت نہیں۔ گاؤں کا نام لکھنا بھی ضروری نہیں۔ کیا پتا وہ میرا ہی گاؤں ہو۔

چوہا چور کوئی نامی گرامی چور نہیں تھا۔ وہ جس زمانے کا چور تھا' اس میں چوروں کا بھی ضابطہ ء اخلاق ہوتا تھا مگر وہ اس کا بھی پابند نہیں تھا۔ مثلاً" اس نے اکثر چوریاں اپنے ہی گاؤں میں کیں حالانکہ مشہور تھا کہ جس گاؤں میں چور پیدا ہو جائے' وہاں کے لوگ رات کو سکھ کی نیند سوتے ہیں۔ ساتھ کے گاؤں میں اس کے ہم عصر کریم چور نے بڑا نام پیدا کیا تھا' اس کے ہوتے اس کے گاؤں میں کبھی چوری نہیں ہوئی تھی۔

چوہا چور ایک ہی ضابطہ ء اخلاق کا قائل تھا کہ چور کو چوری کرنی چاہیے' خواہ وہ اپنے ہی گھر میں کیوں نہ ہو۔ مشہور تھا کہ پورا ایک سال اسے چوری کرنے کا موقع نہیں ملا تھا' یا تو چوکیدار اسے عین موقع پر آلیتا اور وہ فرار ہونے پر مجبور ہو جاتا یا گھر کے لوگ جاگ اٹھتے۔ زچ ہو کر اس نے اپنے ہی گھر کی چوری کر لی تھی--- اپنے چھوٹے بھائی کے ہاں جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔

گھر کا جو کمرہ اسے بٹوارے میں ملا تھا' اس کے پیچھے کوٹھڑی تھی۔ دلہن نے "بھڑولے" کی تہہ میں اپنے زیور رکھے ہوئے تھے۔ بھڑولے میں گندم بھری ہوئی تھی۔ اس نے گلی کی طرف سے نقب لگائی اور بھڑولے کے سوراخ پر مٹی سے چپکا ہوا

ڈھکنا ہٹایا۔ بھڑولے نے بہت سی گندم باہر انڈیل دی۔ فرش پر ڈھیر سا لگ گیا۔ تہہ میں رکھی پوٹلی کو ٹٹول کر نکال لینے میں اسے کوئی خاص دقت نہ ہوئی۔ کھرا (قدموں کے نشان) اس نے پکی سڑک پر جا کر گم کر دیا۔

پھر چوہا چور نے کہا: "لڑکی! یہ کارستانی چوہدری کریم کی ہے۔ دیکھتا ہوں کہ اسے میرے گھر میں چوری کرنے کی جرات کیسے ہوئی؟" وہ کریم چور کے گاؤں گیا یا کالے چور کے، کسی کو کھوج لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ سبھی کو یقین تھا کہ زیور خود چوہا چور نے چرائے ہیں۔ چوری کا چسکا بھی شراب کے نشے سے کم نہیں ہوتا، جو منہ کو لگ جائے تو چھٹتی نہیں۔ وہ ایک رات باہر رہ کر واپس آیا تو زیوروں کی پوٹلی بھرجائی کو دے کر بولا: "لڑکی! دیکھ لے کوئی زیور کم تو نہیں؟"

اسے چوہا چور کا جو لقب ملا تھا، اس کی وجہ تسمیہ کچھ یوں ہے۔ وہ ایک "چھیٹکا" سا جوان تھا --- دبلے پتلے پھرتیلے جسم کا مالک۔ بدن میں بہت لچک تھی۔ سکڑ سمٹ کر چھوٹے سے سوراخ سے بھی گزر جاتا۔ اس کی لگائی ہوئی نقب سے چوہا گزر جائے تو گزر جائے، کسی آدمی کے بچے کا گزر ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

اوپر میں نے کریم چور کو چوہدری کہا ہے، اس لئے نہیں کہ چور اچکا چوہدری ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ رات کو وہ چور ہوتا اور دن کو چوہدری۔ دس بارہ گھماؤں زمین کا مالک بھی تھا۔ لٹھے کا کرتہ اور تہبند، سر پر کلّے والی پگڑی جس کا طرہ بھی نکلا ہوتا، پاؤں میں نازک سی دیسی جوتی اور ان کے نیچے سبک رفتار گٹھے ہوئے جسم والی گھوڑی۔ سنا تھا کہ گاؤں کی پنچایت کا اکثر اسے سرپنچ بھی چنا جاتا۔

میں نے اپنے لڑکپن میں اسے دیکھا تھا، اپنے ننھیالی گاؤں میں جہاں وہ ایک شادی میں شریک ہوا تھا۔ میں نے اپنے ماموں سے جو اس گاؤں کے پیر تھے، اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں اسے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر گاؤں کے تکیے میں گئے جہاں برات اُتری ہوئی تھی۔ کریم انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ماموں

نے کہا: "چوہدری کریم! یہ لڑکا تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

اُس نے جھک کر میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور بولا: "چھوٹے پیرجی! آپ نے یہاں آکر میری عزت بڑھائی۔ فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

میں نے ہچکچا کر کہا: "چچا! یونہی--- میرا مطلب ہے--- ہمارے گاؤں میں بھی ایک چور ہے کیا آپ اسے جانتے ہیں؟ میں نے اپنے گاؤں کا نام بتایا۔"

چوہدری کریم کھلکھلا کر ہنسا: "کیوں نہیں ؟--- جانتا ہوں--- چوہا چور کو کون نہیں جانتا--- اپنا دوست یار بھی ہے۔"

"لیکن وہ آپ کی طرح کا کیوں نہیں ؟" میں نے پوچھا۔

وہ میرے سوال پر کچھ دیر خاموش رہا' پھر مسکرا کر کہنے لگا "بھتیجے! وہ صرف چور ہے چوہدری نہیں--- اپنے ہی گاؤں میں چوری کرتا ہے--- لیکن کالے کوسوں دُور کسی گاؤں میں ہونے والی چوری میں پھر بھی پولیس اسے دھر لیتی ہے۔ میں تھانے کے اندر بھی چوری کر لوں' پولیس مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالتی۔"

چوہدری کریم کی یہ منطق فوراً" میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ چور ضرور تھا لیکن رکھ رکھاؤ کا قائل' وضع دار قسم کا' طرہ اونچا رکھ کر چوری کرنے والا چور۔ صرف اُسے لوٹتا جو لوٹے جانے کے قابل ہو۔ پھر سخی بھی تھا۔

چوہا چور بھی دوچار کھیتوں کا مالک تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی سے مل کر ایک مشترکہ کنویں پر زراعت بھی کی لیکن چوہدری کبھی نہ بن پایا دن کو نہ رات کو۔ میلے کچیلے کپڑے' ڈیڑھ ہاتھ کا صافہ سر پر' پاؤں میں لتھڑے ہوئے ٹُوٹے پھُوٹے جُوتے۔ اگر کبھی دھلے کپڑے اور نئے جوتے پہن لیتا تو وضع قطع سے بے تُکا معلوم ہوتا۔ اُسے کبڈی کھیلنے کا شوق تھا۔ کبڈی ڈالنے جاتا تو بڑی ترت پھُرت دکھاتا لیکن پکڑ ڈالنے والے حریف سے دوچار قدم دور رہ کر۔ مجال ہے کہ بدن پر ہاتھ لگنے دے۔ وہ کبڈی کا ایسا کھلاڑی تھا جو کسی کو مارتا ہے نہ خود مرتا ہے' تماشا دیکھنے والا جس لطف کی تلاش

میں آتا ہے وہ ہیرا پھیری کر کے اسے بھی چرا لیتا ہے۔ چوہا چور اکثر چوری کر کے پکڑا جاتا۔ دوسروں کی چوری بھی اس کے نام لگ جاتی۔ اسے اپنے ہی گاؤں کے لوگوں کے سامنے مار پڑتی۔ مار پڑتی تو چیختا بہت تھا۔ ایک بار چیخ دھاڑ سن کر میں بھی نمبردار کی حویلی میں چلا گیا جہاں پولیس آ کر ٹھہری تھی۔ ایک پولیس مین اسے پیٹ رہا تھا اور غلیظ گالیاں بھی دے رہا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ ایک دو گالیاں تماشا دیکھنے والوں کی طرف بھی پھینک دیتا۔ میں نے عزت سادات خطرے میں دیکھی تو وہاں سے کھسک آیا۔

پھر یہ خبر اڑی کہ چوہا چور نے چوری مان لی۔ اس نے کماد کے ایک کھیت میں مال دبا رکھا تھا۔ دو سپاہیوں کی حفاظت یا حراست میں وہ کماد میں گھس گیا۔ جب باہر نکلا تو ایک گٹھڑی اس کے سر پر تھی۔ اب حویلی کے اندر کا منظر پبلک کے لئے ممنوع قرار دے دیا گیا۔ گاؤں کے دو نمبردار تھے' وہ بتاتے تھے کہ ہماری موجودگی میں گٹھڑی کھولی گئی۔ جس کی چوری ہوئی وہ بھی موجود تھا۔ اس نے کہا کہ جناب کپڑے تو پورے ہیں لیکن پانچ تولے کا زیور کہاں گیا؟ اب چوہا چور کے بجائے بیچارے "سادھ" کو لتر پڑے۔ نمبرداروں کی سفارش پر دو چار لتروں ہی پر اکتفا کر لیا گیا۔ ایک کورے کاغذ پر اس سے انگوٹھا لگوا لیا گیا کہ مال پورا ہے۔ معلوم ہوا کہ مال ملے گا اس وقت جب عدالت سے چور کو سزا مل جائے گی۔ چوہا چور ایک ہفتہ پولیس کا مہمان رہا۔ وہ تو چھوٹ گیا لیکن بے چارے سادھ کو کپڑوں کی گٹھڑی بھی نہ ملی۔ البتہ عدالت میں پیشیوں سے بچ گیا۔

میں نے ایک دن سر راہ اس سے پوچھا: "چاچا اللہ رکھے! کیا چوری ہونے والا مال مل گیا؟"

"بھتیجے! مال کیا ملتا؟ دو تین مرغیاں تھیں وہ بھی پُلیسے چٹ کر گئے پھر بھی اللہ کا شکر ہے کہ عزت بچ گئی۔"

میں ایک عرصے تک اپنے آپ سے پوچھتا رہا کہ چاچا رکھے کی عزت کس مٹی

سے بنی تھی کہ مال گنوانے اور لُتر کھانے کے بعد بھی بچی رہی۔ ابھی تک مجھے اس سوال کا جواب نہیں ملا۔

اور مجھے اس محاورے کی عملی تفسیر مل گئی کہ چوروں کو مور کیسے پڑتے ہیں۔

ماسی حاجن کے ہاں جو چوری چوہا چور نے کی' وہ میرے ہوش سے پہلے کی ہے لیکن یہ واقعہ میرے گاؤں میں بہت اہمیت کا حامل تھا' اس لئے ایک دو نسلوں تک چلا اور اب میں یہ کہانی لکھ کر اپنے سے بعد کی نسل کو پہنچا رہا ہوں۔ یہی دو چار کہانیاں تو گاؤں کی کل کائنات ہوتی ہیں۔

ماسی حاجن بڑی دیندار خاتون تھی۔ ابھی جوان ہی تھی کہ حج کا شوق اس کے دل و دماغ میں چھا گیا۔ اس نے پیسہ پیسہ بچا کر حج کے لئے رقم جمع کی اور جب رقم پوری ہوئی تو وہ ادھیڑ عمر کی ہو چکی تھی۔ ہزار ڈیڑھ ہزار روپے کے سکے تھے جو اس نے لوہے کی ایک صندوقچی میں ڈال کر گھر کی سب سے پچھلی کوٹھڑی کے فرش میں دفن کر دیئے تھے۔ اس کا پتا صرف اس کے خاوند کو تھا۔

کہتے ہیں کہ چور کو قدرت نے ایک حس زیادہ دی ہوتی ہے' جی تو نہیں مانتا کہ قدرت نے چوہا چور پر بھی یہ مہربانی کی ہو گی پر اس نے عین اسی کوٹھڑی میں نقب لگائی جہاں صندوقچی دبی ہوئی تھی اور فرش بھی وہیں سے کھودا جہاں صندوقچی دبی ہوئی تھی جس طرح آیا تھا' اسی طرح سے واپس چلا گیا لیکن صندوقچی لے کر۔

صبح گلی میں سے گزرتے ہوئے کسی نمازی نے نقب دیکھی اور چلا کر کہا ''گھر والو! تم لٹ گئے ہو۔''

ماسی حاجن بڑی صبر و شکر والی خاتون تھی' جزع فزع سے باز رہی۔ چور کو بد دعا بھی نہ دی' صرف اتنا کہا ''اللہ کو مجھ گنہگار کا حج منظور نہ تھا۔''

گاؤں کے لوگ چاہتے تھے کہ چوہا چور کو مسجد میں لے جا کر قرآن اس کے سر پر رکھیں اور قسم لیں لیکن ماسی نے منع کر دیا۔ کہنے لگی ''اس کا وبال اس کی اولاد پر

پڑے گا۔"

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیوں اور کیسے اسی دن سے لوگ اسے ماسی حاجن کے نام سے پکارنے لگے۔

ایک روایت یہ بھی مشہور تھی کہ ماسی کو خواب میں حج نصیب ہو گیا تھا۔ گاؤں کے واحد حاجی بابا اللہ داد نے ماسی کی زبانی اس کا خواب سنا تو رونے لگا۔ اس نے خواب میں دیکھی ہوئی ہر تفصیل کی تصدیق کی اور کہا "ہم اتنی تکلیفیں برداشت کر کے حج تو کر آئے پر کیا پتا حج قبول بھی ہوا یا نہیں اور اس بی بی کو خدا نے خواب میں حج کرایا' تو سمجھو اسے قبول بھی کر لیا۔"

پر چوہا چوز چوری سے باز نہ آیا۔ چور سے قطب بننے والے لوگ اور ہی ہوتے ہیں۔ نظرِ کیمیا اثر بھی تو جوہرِ قابل ہی کو متاثر کرتی ہے۔

دو اڑھائی سال بعد چوہا چور نے اپنی بیٹی کی شادی خاصی دھوم دھام سے کی اور اسے جہیز بھی اچھا دیا۔

ماسی نے کہا: "چلو میرا پیسہ میری دھی کے تو کام آیا۔"

ایک چوری میں وہ پکڑا گیا' مقدمہ بنا اور اسے تین سال کی سزا ہو گئی' چھٹ کر آیا تو سیدھا مسجد میں پہنچا۔ غسل خانے میں نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنے اور اعلان کر دیا کہ آج سے وہ چوری سے تائب ہو گیا ہے۔

مشہور ہے کہ چور چوری سے جائے تو جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ ایک بار وہ دیسی شراب کی خفیہ بھٹی چلانے پر بھی پکڑا گیا۔ پھر مشہور ہوا کہ وہ پُڑیاں بیچتا ہے۔ گاؤں میں کئی نوجوان پڑیوں کے عادی ہو گئے اور چوریاں بڑھ گئیں۔ گاؤں کی ایک مسجد سے پنکھے اور کلاک غائب ہوئے' دوسری میں پانی کے لئے جو موٹر لگی تھی' وہ کسی نے اکھیڑ کر بیچ کھائی۔ یہ کام پُڑیوں کے عادی نوجوانوں نے کیا۔

لوگوں نے کہا کہ ان کا گناہ بھی چوہا چور کے نامہء اعمال میں لکھا جائے گا۔ اور

ایک دن گاؤں کی بڑی مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہوا کہ "فلاں" چودھری حج پر جا رہا ہے۔ کسی کو اس سے کچھ لینا دینا ہو تو مسجد میں آ جائے۔

اس اعلان کے پیچھے صرف اتنی سی داستان ہے کہ اس چودھری کے ایک بیٹے نے شہر میں جا کر ٹریکٹروں کی مرمت کا کام سیکھا اور اپنے گاؤں میں ورکشاپ کھول لی۔ اس کی ورکشاپ چل نکلی۔ اس نے اتنی رقم پس انداز کر لی کہ باپ کو حج پر بھیج سکے۔ پر اس کے باپ نے بہت لیت و لعل سے کام لیا اور کہتا رہا کہ حج کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا' پہلے اپنا مکان پکا کر لو' اپنی زمین پر ٹیوب ویل لگاؤ اور ٹریکٹر خرید کر کرائے پر چلاؤ۔

لیکن بیٹے کی ایک ہی رٹ تھی کہ ابا حج پر جاؤ۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو چور کی بجائے ایک حاجی کا بیٹا کہلوانا چاہتا تھا۔ چنانچہ مجبور ہو کر چوہا چور نے باقاعدگی سے مسجد میں جانا شروع کر دیا' داڑھی رکھ لی' کچھ مسئلے مسائل بھی سیکھے۔ لوگ کہنے لگے کہ اب وہ سچے دل سے تائب ہو گیا ہے۔

جب نماز روزہ پکا ہو گیا تو اس نے بیٹے سے کہا "اب میں حج پر جانے کو تیار ہوں۔"

مسجد سے لاؤڈ سپیکر پر جو اعلان ہوا وہ ماسی حاجن نے بھی سن لیا۔ وہ اعلان کروائے بغیر حج پر چلا جاتا تو ماسی کچھ نہ کہتی۔ اب اس پر فرض عائد ہو گیا تھا کہ مسجد میں جائے اور اپنا مقدمہ دائر کرے۔

چنانچہ جب وہ مسجد کے صحن میں پہنچی' اس وقت چوہا چور اجلے کپڑے پہنے' نمازیوں کے جھرمٹ میں دلہا بنے بیٹھا تھا کیونکہ دو تین ہار اس کے گلے کی زینت تھے۔

جونہی ماسی نے مسجد کے صحن میں قدم رکھا' مسجد کی فضا میں ایک عجیب سی سنسناہٹ پیدا ہوئی اور لوگوں نے جانا کہ ہوا کا کوئی تیز جھونکا اس کے روئیں روئیں کو

سر سرا کر گزر گیا ہے۔

چُوہا چور کانپنے لگا۔

مولوی صاحب نے پوچھا: "ماسی! تم کیوں آئیں؟"

ماسی نے چوہا چور کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "مولوی جی! کیا اس کا حج قبول ہو جائے گا؟"

"یہ تو اللہ کو معلوم ہے ماسی! میں کون ہوتا ہوں کہ حج کے قبول ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ دے سکوں۔" مولوی صاحب بولے۔

"کیا اسے یقین ہے کہ اس کا حج قبول ہو جائے گا؟" ماسی نے پھر پوچھا۔

"اس کا جواب تو چوہدری ہی دے سکتا ہے ماسی حاجن!" مولوی صاحب نے جواب دیا۔

سارے نمازیوں کی نظریں چوہا چور کے چہرے پر جم گئیں جس پر لہو کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا تھا--- چند لمحوں کے بعد کہ جو لوگوں کو بہت ہی طویل محسوس ہوا، وہ آنکھیں جھکا کر بولا "ماسی حاجن ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میرا حج قبول نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں ابا!" اس کے بیٹے نے گھبرا کر پوچھا۔ چُوہا چور بیٹے کو ایک نظر دیکھ کر زار و قطار رونے لگا۔

ماسی نے اس سے مخاطب ہو کر کہا "اللہ کے بندے! تمہیں اتنا بڑا بول نہیں بولنا چاہئے۔ دنیا میں کون ہے جو "لینے دینے" کا پورا حساب چُکا سکتا ہو---- میں نہ تم--- اچھا اپنا حساب تم جانو، میرا تم سے کوئی لینا دینا نہیں--- اللہ تمہارا حج قبول کرے!" یہ کہہ کر ماسی حاجن مسجد سے چلی گئی۔

چُوہا چور کچھ دیر گھٹنوں میں سر دیئے روتا رہا۔ پھر اس نے گلے سے ہار نوچے، گریبان پھاڑا اور پگڑی گلے میں ڈال کر مسجد سے نکل گیا، جب وہ گلی میں پہنچا تو زور سے چلایا "لوگو! سن لو، میرا حج قبول ہو گیا۔ میرا حج قبول ہو گیا۔"

وہ گلیوں سے ہوتا ہوا قبرستان میں جا پہنچا اور وہاں ایک کونے میں ایک ببول کے سائے تلے بیٹھ گیا اور منہ پر چپ کی مہر لگالی۔ کیا چور قطب ہو گیا تھا؟

اللہ جانے!

لیکن سعادت مند بیٹے کو ساری عمر یہ افسوس رہا کہ وہ اپنے آپ کو حاجی کا بیٹا نہ کہلوا سکا!

(نومبر ۱۹۹۲ء)



معجونِ سنگ دانہ ء مُرغ

میں جس گلی میں رہتا ہوں' اس کے اختتام پر ایک کھوکھا ہے جس کے مالک ایک پہلوان جی ہیں۔ یہاں ردّی اکٹھی کرنے والے اخبار اور رسالے آ کر بیچتے ہیں۔ پہلوان جی کو ردی میں کوئی کتاب یا رسالہ اچھی حالت میں مل جائے تو چھانٹ کر الگ کر لیتے ہیں۔ مجھے کوئی کتاب یا رسالہ اچھی حالت میں مل جائے تو سستے داموں خرید لیتا ہوں۔ بعض اوقات تو تازہ بتازہ اردو اور انگریزی ڈائجسٹ بھی مل جاتے ہیں۔

پہلوان جی خود بھی صاحبِ ذوق ہیں۔ فرصت کے وقت اکثر ان کے ہاتھ میں کوئی کتاب یا رسالہ ضرور ہوتا ہے۔ ایک بار ایک کتاب ان کے ہاتھ میں دیکھ کر میں نے پوچھا "پہلوان جی! یہ کون سی کتاب ہے؟"

چونکہ اس کا سیاق و سباق غائب تھا' اس لئے کتاب انہوں نے میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں بے اختیار پکار اٹھا "پہلوان جی! یہ تو شعرالعجم ہے--- آپ نے پڑھی؟"

"کہیں کہیں سے۔"

"پسند آئی؟"

انہوں نے سوچ سمجھ کر قدرے توقف کے بعد جواب دیا "مصنّف سے بات کچھ بن نہیں سکی۔ سمجھے کہ نہ سمجھے۔"

میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

مولانا شبلی کی شعرالعجم اور پہلوان جی کہہ رہے ہیں کہ مصنف سے بات بن نہیں سکی۔

میں نے کہا "میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔"

ویسے "سمجھے کہ نہ سمجھے" پہلوان جی کا تکیہ کلام ہے۔

انہوں نے سیاق و سباق کے بغیر ایک بوسیدہ سی کتاب اپنی گدی کے نیچے سے نکالی اور اس کا ایک اقتباس پڑھ کر مجھے سنانا شروع کر دیا۔ ہر فقرے کے بعد "سمجھے کہ نہ سمجھے" کی گردان نے نثر کی فصاحت و بلاغت میں خاصا اضافہ کیا۔ جب سنا چکے تو پوچھنے لگے "سمجھے کہ نہ سمجھے۔ کیسی عبارت ہے؟"

"کمال ہے۔" میں بولا۔

یہ نسیم حجازی کے کسی ناول کے زخمی اور جاں بلب ہیرو کی آخری تقریر کا ایک اقتباس تھا۔ اس کے مقابلے میں بیچاری "شعرالعجم" خاصی خستہ و خجل نظر آئی۔

اچانک پہلوان جی نے ڈکار مارا تو میں لرز گیا۔ ان کے ڈکار میں ایک چھوٹے موٹے کریکر کے پھٹنے کا انداز تھا۔ کھوکھے کے ایک کونے میں اکڑوں بیٹھے ہوئے ایک ردی والے نے پوچھا "پہلوان جی! آپ حکیم صاحب کے ہاں گئے؟"

"نہیں! فرصت ہی نہیں ملی۔"

"ان کا دواخانہ خفتاں کی نماز کے بعد بھی کھلا رہتا ہے۔"

"جاؤں گا۔۔۔ ضرور جاؤں گا۔" انہوں نے ایک اور ڈکار مار کر کہا "سمجھے کہ نہ سمجھے"۔

ردی والا بولا۔ "پہلوان جی! بے بے اب توں پر بیٹھتی ہے تو اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ میری گھر والی کہتی ہے' بے بے! اسی توں سے بچوں نے بھی کھانا ہے۔ وہ اٹھ تو جاتی ہے پر مجھے یوں لگتا ہے جیسے بے بے کا رج نہیں ہوا۔"

پہلوان جی نے قہقہہ لگایا "حکیم جی کی دوائی دوائی نہ ہوئی۔ سمجھے کہ نہ سمجھے نوش دارو ہو گیا۔"

ردی والے نے اپنی ردی تلوائی' پیسے لئے اور چلا گیا تو میں نے پوچھا "پہلوان

جی! یہ آدمی کیا کہہ رہا تھا؟"

"میاں جی! اس کی ماں کی بھوک مر گئی تھی۔ کچھ کھا لیتی تو کھٹے ڈکار آتے۔ چوُرن کھا کھا کر بیچاری کا بُرا حال ہو گیا تھا۔ کسی نے اسے ایک حکیم صاحب کا پتا بتایا جو اس بیماری کا علاج کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک معجون دی جس میں مرغ کے پوٹے ڈالے جاتے ہیں۔ سمجھے کہ نہ سمجھے؟"

"سمجھ گیا ہوں۔ یہ حکیم صاحب کہاں مطب کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ پہلوان جی نے مجھے ان کا اتا پتا بتایا۔ اگرچہ سمجھے کہ نہ سمجھے کی گردان میں پتا بھول بھلیاں بن گیا تاہم ایک گنجان آباد محلے کی ایک ٹیڑھی بنگی گلی میں میں نے حکیم صاحب کا مطّب ڈھونڈ ہی نکالا۔ یہ ایک تین منزلہ عمارت کی نچلی منزل میں واقع تھا۔ اس کا دروازہ گلی سے ایک قدم اونچا تھا' اس لئے نالی کے اُوپر ایک پتھر رکھا ہوا تھا۔ نالی اُوپر سے بند نہیں تھی اور غلیظ پانی پر مچھر تیر رہے تھے اور خاصی بو آ رہی تھی البتہ مطب کے اندر کا منظر باہر سے کہیں زیادہ خوشگوار نظر آیا۔ میرا مطلب ہے مطّب صاف ستھرا تھا اور دیواری شیلفوں میں ڈبے' بوتلیں اور مرتبان سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ حکیم صاحب ایک صاف ستھری مسند پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے ایک چوکی تھی۔ مقابل کی دیوار کے ساتھ دو بینچ لگے ہوئے تھے۔ ایک بینچ پر آج کے تازہ اخبار کے ورق بکھرے ہوئے تھے اور ایک صاحب اس پر بیٹھے ہوئے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے "السلام علیکم" کہی تو حکیم صاحب نے بڑی خوش دلی سے اس کا جواب دیا اور کہا "تشریف رکھیے۔" دوسرے صاحب نے مجھے صرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور مطالعے میں محو ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی سو کر اُٹھے ہیں اور منہ ہاتھ دھوئے بغیر سیدھے حکیم صاحب کے مطّب پر پہنچ گئے ہیں۔ مُسلا ہوا کرتا اور نہایت میلی سی دھوتی۔ گالوں پر دو تین دنوں کی تل چانولی داڑھی۔ ظاہر تھا کہ روزانہ شیو نہیں کرتے' اخبار خرید کر نہیں پڑھتے لیکن اخبار کے اتنے رسیا ہیں کہ ناشتہ بھی

اسی کا کرتے ہیں۔

میں نے ابھی اخبار نہیں پڑھا تھا۔ اس میں کوئی خبر ضرور چھپی تھی کہ دُھوتی والے صاحب بولے "اس سکینڈل نے حکومت کو بہت بدنام کیا ہے۔"

غالباً" ان کا اشارہ کواپریٹو بینکوں والے سکینڈل کی طرف تھا۔ حکیم صاحب بولے "شیخ صاحب! وہ جو کارخانوں کی پرائیویٹائیزیشن ہو رہی ہے' وہ بھی تو کم سکینڈل نہیں۔" اس طرح خبروں پر جو تبصرے ہوتے رہے' اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ حکیم صاحب اور شیخ صاحب دونوں سیاسی ذہن رکھتے ہیں اور عملی سیاست میں حصہ بھی لیتے ہیں۔

شیخ صاحب اپنا دل کا غبار نکال کر چلے گئے تو حکیم صاحب میری طرف متوجہ ہوئے "معاف کیجئے گا۔ میں آپ کو توجہ ہی نہ دے سکا۔ ذرا یہاں تشریف لائیے۔"

میں بینچ سے اُتر کر مسند پر ان کے قریب جا بیٹھا۔ انہوں نے جھٹ سے میری نبض پر ہاتھ رکھ دیا اور چند لمحوں کے بعد بولے "دل' جگر' گردے' مثانہ یعنی سبھی اعضائے رئیسہ ٹھیک ٹھاک کام کر رہے ہیں۔ کتنی عمر ہے جناب کی؟"

"یہی انہتر ستر سال۔"

"ماشاء اللہ --- ماشاء اللہ --- اس عمر میں اتنی اچھی صحت!"

"نہیں حکیم صاحب! صحت اتنی اچھی بھی نہیں جتنی آپ کہہ رہے ہیں مثلاً" مجھے دمہ ہے اور پیٹ میں گرانی رہتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کے ہاں ایک معجون ہے جس میں مرغ کے پوٹے پڑتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ معجون سنگ دانہ ء مرغ کی بات کر رہے ہیں۔ اس مطب کی اس معجون کو بہت زیادہ شہرت ملی ہے حالانکہ ہم نے کبھی اس کا اشتہار نہیں دیا۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ آپ کو بھوک تو لگتی ہے؟"

"بھوک تو لگتی ہے لیکن کھانے کے بعد پیٹ میں گرانی سی ہو جاتی ہے۔"

"اس کا علاج چورن ہے۔ فی الحال وہ لے جائیے۔"

میں پھر بینچ پر بیٹھ گیا۔

حکیم صاحب چورن کا پڑا باندھ رہے تھے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان بھی تھے۔ اس چورن کو آپ ہمارا خاندانی ورثہ سمجھئے جس میں ہر آنے والا کوئی نہ کوئی اضافہ کرتا رہا ہے۔ میرے والد مرحوم اسے بہب کہا کرتے تھے۔ میں نے زیادہ توجہ معجون سنگ دانہ ء مرغ پر دی ہے جو بھوک بھی لگاتی ہے اور نظامِ ہضم بھی درست کرتی ہے۔ نسخہ اس کا بھی ہمارا خاندانی ہے۔" اس کے کچھ اجزا تو صرف ہمارے مطب سے مخصوص ہیں۔

حکیم صاحب میرے ساتھ جس اردو میں بات چیت کر رہے تھے' وہ رہتک کرنال کی اردو معلوم ہوتی تھی۔ خاندان شریفی والی اردو نہیں تھی۔ مجھے حکیم محمد نبی سویدامرحوم کے مطب پر جانے کا بھی شرف حاصل ہوا ہے اور ان کی اردو بھی سنی ہے۔ اس اردو میں کوثر و تسنیم کے پانیوں کا اثر تھا کہ آدھا مرض اردو سن کر جاتا رہتا۔ حکیم محمد حسن قریشی مرحوم سے دو تین ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا۔ نہایت وجیہہ پنجابی شخصیت کے مالک تھے لیکن شین قاف سے درست اردو بولتے تھے۔ یہی گمان گزرتا تھا کہ کوئی دہلوی بات چیت کر رہا ہے۔ ان کی اردو میں بھی خاصی شفا تھی۔ مجھے یہ کیفیت حکیم صاحب کی اردو میں محسوس نہ ہوئی تو کچھ مایوسی ہوئی تاہم یہ سوچ کر تسلی ہوئی کہ میں حکیم صاحب سے دوا لینے آیا ہوں' اردو سننے تو نہیں آیا۔

انہوں نے پوچھا "آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اس دواخانے کی معجون سنگ دانہ ء مرغ خاص چیز ہے۔"

میں نے انہیں پورا قصہ سنایا تو بہت محظوظ ہوئے بلکہ ایک مرتبان سے کہ جس پر خمیرہ گاؤ زبان عنبری جواہر والا' کی چٹ لگی ہوئی تھی' ایک چمچہ خمیرہ نکالا' اسے ایک سفید کاغذ کے پرزے پر چپکایا اور اس کے اوپر ایک ورق نقرہ لگا کر مجھے پیش کیا

اگرچہ کاغذ چاٹنے میں مجھے کچھ کراہت سی محسوس ہوئی تاہم خمیرے کے ذائقے اور لطافت نے اس کی تلافی کر دی۔ میں نے خمیرے کی بہت تعریف کی اور کاغذ کی ایک گولی سی بنا کر سوچنے لگا کہ اسے کہاں پھینکوں۔ تب حکیم آڑے آئے۔ "باہر نالی میں پھینک دیجئے۔"

عین اُس لمحے دہلیز کے پتھر پر ایک صاحب آ کھڑے ہوئے، گولی انہیں جا لگی۔ کاغذ کی گولی انہیں کیا محسوس ہوتی۔ انہوں نے "السلام علیکم" کی جگہ ایک ڈکار لیا۔

"آیئے بٹ صاحب!" حکیم صاحب نے مسند پر کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ چھوٹا سا مطبّ بٹ صاحب کے وجود سے لبالب بھر گیا۔ وہ میرے پاس بینچ پر بیٹھے تو مجھے اپنا وجود نقطہء موہوم معلوم ہونے لگا۔

حکیم صاحب بولے "بٹ صاحب! معجون سنگ دانہء مرغ کھانے سے لکڑ ہضم ہو جاتی ہے اور چھوٹا موٹا پتھر بھی لیکن اتنے بڑے بڑے پلاٹ اور دکانیں تو ہضم نہیں ہو سکتیں؟"

جواب میں بٹ صاحب نے اتنا خوفناک قہقہہ لگایا کہ میں لرز گیا۔ فلموں اور ڈراموں میں ایسے قہقہے عام سننے میں آتے ہیں۔ میں انہیں نقلی سمجھتا تھا، اب معلوم ہوا کہ وہ اصلی ہوتے ہیں۔

اس نوع کی مخلوق گزشتہ پندرہ بیس سالوں سے پاکستان میں عام نظر آتی ہے۔ گوشت کا ایک ٹیلا--- اے ماؤنڈ آف فلیش (A Mound of Flesh) کہ جس کی تعمیر میں نجانے کتنے لوگوں کا گوشت پوست اور خون پسینہ صرف ہوتا ہے۔ پھُولا پھالا چہرہ بڑی بڑی خونخوار آنکھیں گردن کندھوں میں دھنسی ہوئی، تنگ پیشانی کے پیچھے مغز دو صد خر کہ جس کے محیرالعقول کارنامے اکثر اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ لیکن اس سے فکر انسانی کا کوئی معجزہ وجود میں نہیں آتا۔ یہ مخلوق ٹیلی ویژن پر عام نظر آتی ہے۔ کبھی کسی سکول کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے، کبھی معذور اور محتاج لوگوں میں چیک

تقسیم کرتے ہوئے، کبھی سیلاب زدہ افراد کی جھولی میں پکے چاولوں کا کڑچھا ڈالتے ہوئے، کڑچھا ہاتھ میں اور چہرہ کیمرے کی طرف--- ستم یہ کہ موٹی گردن میں گلاب کے پھولوں کے ہار بھی ہوتے ہیں۔ اس مخلوق کے سامنے پوری قوم گداگر نظر آتی ہے۔

چنانچہ میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ یہ بٹ صاحب اگر ایم پی اے نہیں تو کونسلر ضرور ہیں۔

میرا اندازہ درست نکلا۔

بٹ صاحب کے جانے کے بعد حکیم صاحب نے تصدیق کی کہ وہ اس علاقے کے کونسلر ہیں۔ ان کے والد کبھی سری پائے پکا کر فٹ پاتھ پر دیگچا لگایا کرتے تھے اور اب ایک ہوٹل کے مالک ہیں۔ ان کے ایک برادرِ نسبتی وزارت پر فائز ہیں۔

میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ بٹ صاحب کا جس سیاسی پارٹی سے تعلق ہے، حکیم صاحب اس کے پرانے ممبر ہیں۔

"بٹ صاحب صدر ہوں گے؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ صدر تو شیخ صاحب ہیں جو اپنا اخبار بھی خرید کر نہیں پڑھ سکتے اور یہ ناچیز سکریٹری ہے جو اپنے مطب کے لئے مین بازار میں کوئی دکان کرائے پر نہیں لے سکتا۔"

"قصور آپ کا اپنا ہے۔ آپ معجون سنگ دانہ ء مرغ نہ خود کھاتے ہیں، نہ شیخ صاحب کو کھلاتے ہیں۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

حکیم صاحب ہنسے اور مسند سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مصافحہ کرتے ہوئے کہا "آپ سے تعارف تو ہوا ہی نہیں۔"

میں نے تعارف کرایا تو کہنے لگے "مجھے کیا معلوم تھا کہ میں اتنے عظیم انسان سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کر رہا ہوں جو پروفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوا اور

دنیائے ادب میں جس کے ڈنکے بج رہے ہیں۔"

اگرچہ حکیم صاحب نے میری جو تعریف کی' وہ مبالغے کی حد تک جا پہنچی تھی تاہم انکسار اور فروتنی کے باوجود مجھے اپنی ذاتِ والا صفات پر بہت فخر محسوس ہوا لیکن جب ویگن پر سوار ہونے کے لئے دھوپ میں کھڑا ہوا اور دھکے بھی کھائے تو نہ صرف ندامت محسوس ہوئی بلکہ عبرت بھی۔

حکیم صاحب سے بعدازاں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کے علاج سے پیٹ کی گرانی بھی رفع ہو گئی۔ ان سے خاصی بے تکلفی بھی پیدا ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ بٹ صاحب نے جب کارپوریشن کا الیکشن لڑا تو ایک کچی بستی کے ووٹ انہیں نہیں مل رہے تھے۔ بٹ صاحب نے دو بلڈوزر بستی میں لا کھڑے کئے اور اعلان کیا کہ بستی کے سارے ووٹ ان کے حق میں پڑنے چاہئیں چنانچہ سارے ووٹ ان کے حق میں پڑے لیکن اس سے اگلے دن بلڈوزر کچی جھگیوں اور مکانوں پر چڑھ دوڑے۔ یہ خبر اخبار میں بھی چھپی تھی اور کچھ تصویریں بھی جن میں عورتوں اور بچوں کو ملبے کے ڈھیر پر نہایت بے بسی اور بے کسی کے عالم میں بیٹھے ہوئے دکھایا گیا تھا۔

کارخانوں کی پرائیویٹائیزیشن کا عمل شروع ہوا تو طے ہوا کہ ایک کارخانے کی بولی بٹ صاحب کے حق میں ختم ہو اور پینتیس لاکھ سے نہ بڑھے اگرچہ کارخانہ چالو حالت میں تھا لیکن بٹ صاحب کے نزدیک اس کی قدر و قیمت اس کے محل وقوع کی وجہ سے تھی۔ اس کی زمین پر پلازا تعمیر ہو سکتا تھا اور مارکیٹ بن سکتی تھی۔ کروڑوں کی چیز بٹ صاحب کو کوڑیوں میں مل رہی تھی۔

لیکن کس طرح؟

قصے کا یہ حصہ حکیم صاحب کی زبانی سنئے۔

"بٹ صاحب ہمیں اپنے ساتھ لے گئے تھے یعنی شیخ صاحب کو اور مجھے' بولی دینے والوں میں ہم بھی شامل تھے۔ جب بولی پینتیس لاکھ پر پہنچی اور ایک دو کے بعد

تین ہونے والا تھا تو پیچھے سے ایک آواز آئی "چھتیس لاکھ"۔ بٹ صاحب بھی حیران تھے اور ہم بھی۔ اس کے بعد بولی ایک لاکھ کے حساب سے بڑھتی رہی۔ جب بٹ صاحب نے خود اٹھ کر پچاس لاکھ کی بولی دی تو اجنبی آواز خاموش ہو گئی۔ ایک دو تین ہوا اور بٹ صاحب اچانک غائب ہو گئے۔"

حکیم صاحب خاموش ہو گئے۔

"پھر آپ نے بٹ صاحب کو پاؤ بھر معجون سنگ دانہ ء مرغ کھلائی اور یہ کارخانہ بھی ہضم ہو گیا۔" میں نے ازراہ مزاح کہا۔

حکیم صاحب بے خیالی کے عالم میں مسکرائے کچھ دیر سوچتے رہے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھے کوئی راز کی بات سنانا چاہتے ہوں اور فیصلہ نہیں کر پا رہے۔

بالآخر مجھ سے پوچھنے لگے وہ خبر آپ نے پڑھی تھی؟

"کون سی ؟"

"پروفیسر صاحب! وہی --- دبئی کے ایک پاکستانی تاجر کے جواں سال لڑکے کے اغوا کی؟"

"پڑھی ہو گی' مجھے یاد نہیں۔ ہر روز اغوا کی کوئی نہ کوئی خبر چھپتی رہتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "کیا وہ لڑکا مل گیا ؟"

"ہاں مل گیا---" حکیم صاحب بولے۔

"چلو اچھا ہوا اس کے باپ کو تاوان تو دینا پڑا ہو گا ؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں! بیس لاکھ روپیہ۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا ؟" میں نے پوچھا۔

"اس لڑکے کے اغوا میں میں بھی شریک تھا۔" وہ بولے۔

"حکیم صاحب! آپ مذاق کر رہے ہیں؟"

"نہیں تو براہِ راست نہیں' بالواسطہ طور پر بٹ صاحب نے اپنے آدمیوں کے

علاوہ کسی اور کو نیلام میں شامل ہونے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ نجانے یہ لڑکا کہاں سے ٹپک پڑا۔ جب بولی پچاس لاکھ پر پہنچی تو لڑکے نے اپنی گردن کی پشت پر کسی سرد فولادی چیز کا لمس محسوس کیا اور ایک برفیلی آواز اس کے کان میں آئی لڑکے! اب زبان نہ کھولنا۔"

"حکیم صاحب! ڈرامے کے اس کلائی میکس سے آپ کیسے آگاہ ہوئے۔"

"صرف میں ہی نہیں، سارا محلّہ جانتا ہے۔ میں نے بٹ صاحب سے کہا کہ وہ اب اخلاق کی ہر حد کو پار کر گئے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ حکیم صاحب! میں نے اس سے پورا انصاف کیا۔ اُسی کی وجہ سے مجھے بولی میں پندرہ لاکھ روپے زیادہ دینے پڑے تھے۔ میں نے پوچھا کہ اُوپر کے پانچ لاکھ کا کیا جواز ہے؟ وہ بولے کہ حکیم صاحب! آپ مجھ سے انصاف نہیں کر رہے، اُوپر کا جو پانچ لاکھ خرچ ہوا، وہ میں اپنی جیب سے ادا کرتا؟"

قصہ ختم ہوا تو حکیم صاحب نے سر جُھکا لیا جیسے اپنے گریبان میں جھانک رہے ہوں۔

میں اُٹھنے لگا تو وہ بولے "پروفیسر صاحب! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ اس مطب پر معجون سنگ دانہ ء مرغ تیار نہیں ہو گی۔"

"حکیم صاحب! میں آپ کے فیصلے کا جواز نہیں پوچھ سکتا تاہم اگر آپ بتانا پسند فرمائیں تو میں خواہ مخواہ کی سوچ سے بچ جاؤں گا۔"

"جی!" میں نے ہنگورا بھرا۔

"وہ ردی والا جس کا ذکر آپ نے کیا تھا، کل میرے پاس آیا۔" حکیم صاحب نے کہا۔

"اُس نے عجیب سی فرمائش کی۔ حکیم صاحب! کوئی ایسی دوائی دیجئے جسے کھا کر بُھوک نہ لگے۔ میں اُس کی بات پر بے اختیار ہنس پڑا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اُس کی ماں نے (جیسا کہ آپ نے بھی بتایا تھا۔) معجون سنگ دانہ ء مرغ کی ایک ڈبیا کھائی اور

اب اس کی بھوک کا یہ عالم ہے کہ تون پر بیٹھتی ہے تو اُٹھنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ میں نے اَس سے تون کے معنی پوچھے تو معلوم ہوا کہ اُس کی ماں روٹیوں سے بھری پوری چنگیر کھا جانا چاہتی ہے۔ وہ بچوں کو کیا کھلائے تو پروفیسر صاحب! اَس کی بات سَن کر میں بہت ملول ہوا۔ میرے پاس ایسی کوئی دوا نہیں جس کے کھانے سے بھُوک نہ لگے۔ آپ کو میرے فیصلے کی صحت میں کوئی شک تو نہیں ہو گا۔"

"جی! شک تو ہے۔ بہرحال آپ اپنے فیصلے کے آپ مجاز ہیں۔" میں نے بینچ پر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ایک فیصلہ میں نے اور بھی کیا ہے بلکہ اس پر عمل بھی کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے سکریٹری شپ سے استعفیٰ بھی دے دیا ہے اور شیخ صاحب نے میرا ساتھ دیتے ہوئے صدارت سے۔"

"یہ فیصلہ آپ نے کیوں کیا؟" میں نے اس لئے پوچھا کہ حکیم صاحب مجھ سے اس سوال کی توقع کر رہے تھے۔ ان کے چہرے سے مجھے اس کا اندازہ ہوا۔

"ظالم کا ساتھ دینا بھی تو گویا ظلم میں شریک ہونا ہے۔" حکیم صاحب بولے۔

مضمون یہاں بھی ختم ہو سکتا تھا' اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ کم از کم انجام پر "رجائیت" کا جو پہلو سامنے آیا ہے' وہ برقرار رہتا لیکن سوئے اتفاق سے ایسا نہیں ہوا۔

جب ہفتہ عشرہ بعد میں نے مطبّ کی دہلیز پر قدم رکھا تو ایک سڑاند بھرے ڈکار نے میرا استقبال کیا۔ دیکھا کہ بینچ پر بٹ صاحب بیٹھے ہیں اور حکیم صاحب ایک بڑا سا ڈبا اَس کے ہاتھ میں تھما رہے ہیں۔ اَس میں کم از کم آدھ سیر دوا تو ضرور ہو گی۔ بٹ صاحب کے جانے کے بعد میں نے حکیم صاحب سے پوچھا "اس ڈبے میں کیا تھا؟"

"معجونِ سنگ دانہ ء مرغ" حکیم صاحب بولے اور اِس سے پہلے کہ میں زبان کھولوں' وہ خود ہی کہنے لگا "مجبوری تھی۔ بٹ صاحب کا ہاضمہ اس کے بغیر درست نہیں رہتا۔ یوں میں نے استعفیٰ بھی واپس لے لیا ہے۔"

"کوئی خاص وجہ تھی؟" میں نے پوچھا۔

"بٹ صاحب کو خدشہ تھا کہ میرے استعفی سے ان کے ووٹوں پر اثر پڑے گا۔ شیخ صاحب کو بھی استعفیٰ واپس لینا پڑا ہے۔"

"شیخ صاحب کو بھی بٹ صاحب نے مجبور کیا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"یہی سمجھئے یوں تازہ اخبار کا چسکا بھی تو بہت برا ہوتا ہے۔" حکیم صاحب مسکرائے!

(ستمبر ۱۹۹۵ء)



دارالامان

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب لاہور میں اومنی بسیں چلتی تھیں اور میں کالج جانے کے لئے چوبرجی بس سٹاپ سے بس پر سوار ہوتا تھا۔ بس سٹاپ پر سیمنٹ کی چھت والا شیڈ تھا اور اندر دیواروں کے ساتھ سیمنٹ کے بینچ بھی بنے ہوئے تھے۔ کبھی کبھار بس کے انتظار میں تھک کر میں گرمیوں میں سخت گرم اور سردیوں میں سخت سرد بینچ پر بھی بیٹھ جاتا تھا۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ شیڈ آباد ہو چکا ہے۔ سردیوں کے دن تھے۔ فرش پر ایک میلا کچیلا گدُا بچھا ہوا تھا اور ایک بڑھیا گدے سے بھی زیادہ میلی کچیلی رضائی میں لپٹی ہوئی بینچ کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر اتنی جھُریاں تھیں اور ان میں اتنی میل تھی کہ دیکھنے والوں کے دل میں گھن کی بجائے ہمدردی کا جذبہ ابھرتا تھا۔ اصل میں ہمدردی کے پیچھے ایک خوف ہوتا ہے اور کبھی کبھار عبرت بھی۔ کچھ بھی ہو لوگ اس کے سامنے پڑے ایلومینیم کے پیالے میں کوئی نہ کوئی سکہ ضرور پھینک دیتے تھے اور عارضی طور پر خوف سے چھٹکارا حاصل کر لیتے یا چند لمحوں کے لئے عبرت کا مزہ اٹھا لیتے۔

وہ بڑھیا نہ بولتی تھی نہ کوئی حرکت کرتی تھی البتہ اس کی آنکھیں خاصی متحرک تھیں۔ گدلی گدلی آنکھیں جو ہر آنے جانے والے کو دیکھتیں۔ کچھ افسانہ نگار نہایت تیز حسِ مشاہدہ کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ آنکھوں میں غم، مسرت، حسرت، امید اور ناامیدی غرض ہر اس جذبے یا احساس کا پتہ چلا لیتے ہیں جو انسان کے نہاں خانہ ء دل

میں جنم لیتا ہے اور اکثر وہیں گوشہ نشین رہتا ہے۔ میں بھی افسانہ نگار ہوں لیکن اُڑتی چڑیا کے پَر کاٹ لینے کا فن مجھے نہیں آتا۔ مجھے بڑھیا کی آنکھوں میں کوئی دُکھ درد نظر آیا نہ محرومی کا احساس۔ ایسا لگا جیسے وہ جس ماحول میں ہے' اسے اس کا بھی کوئی احساس نہیں۔ بس جیسا ہے' ویسا ہی ٹھیک ہے۔

میری والدہ اُن دنوں میں اسی پچاسی سال کے پیٹے میں تھیں اور کچھ عرصے سے میرے ہاں لاہور میں مقیم تھیں۔ میں نے ان سے ہنسی ہنسی میں اس بڑھیا کا ذکر کیا تو پوچھنے لگیں "اس کا کوئی آگا پیچھا نہیں؟" میں نے جواب دیا "بے جی! مجھے کیا معلوم؟ ہو گا بھی تو سامنے نہیں آتا۔"

"تو اسے کھلاتا پلاتا کون ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"اللہ تعالیٰ کوئی فرشتہ بھیجتا ہو گا۔ ویسے اس کے پاس ایک گھڑا پانی کا بھرا ہوا پڑا رہتا ہے اور اس کے منہ پر ایلومینیم کا ایک پیالہ ہوتا ہے۔"

میری والدہ میرے اس جواب سے کچھ مطمئن نظر آئیں کہ وہ کوئی بے آسرا بڑھیا نہیں۔ بے جی کے ان استفسارات پر افسانہ نگار کے اندر کا کھوجی بیدار ہو گیا۔ اگلے دن میں نے باتوں باتوں میں ایک چھابے والے سے پوچھا کہ اس مائی کا کوئی آگا پیچھا بھی ہے یا نہیں۔ اس نے جواب دیا "میاں جی اللہ بہتر جانتا ہے۔ میں نے دیکھا تو نہیں لیکن رات کو جب بس سٹاپ خالی ہوتا ہے تو کوئی آتا ضرور ہے۔ آخر مائی کو کوئی تو بول براز کراتا ہو گا۔ ایک بات اور بھی ہے' صبح جب میں چھابا لے کر آتا ہوں تو مائی کا پیالہ خالی ہوتا ہے۔"

افسانہ نگار کا کھوجی کسی اخبار کا رپورٹر نہیں ہوتا کہ بال کی کھال اتارنے لگے۔ بال کی کھال ہی میں تو کہانی کا اسرار چھپا ہوتا ہے۔ افسانہ نگار بھی رپورٹر کی طرح بہت سی باتیں جی سے گھڑتا ہے لیکن رپورٹر اپنی خبر کو حقیقت کا نام دیتا ہے اور افسانہ نگار افسانے کو افسانہ ہی کہتا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں افسانہ لکھتا' کسی رپورٹر نے لون

مرچ لگا کر اس مائی کی کہانی ایک اخبار میں چھپوا دی اور طنزیہ انداز میں پوچھا کہ اگر حکومت اتنی ہی نادار ہو گئی ہے کہ ایسے بے سہارا لوگوں کے لئے دارالامان تعمیر نہیں کر سکتی تو ہر بس سٹاپ پر بنے ہوئے چھپروں کو دروازے لگا دے کہ ایسے بے کس بوڑھے بوڑھیاں سردی گرمی سے تو محفوظ رہیں۔

تب ایک دن مائی غائب ہو گئی۔ میں نے چھابے والے سے پوچھا ”مائی کہاں گئی؟“

”یہ تو معلوم نہیں کہ کہاں گئی؟ کل دو بابو لوگ مائی کو دیکھنے آئے تھے اور اگلی صبح جب میں یہاں آیا تو شیڈ خالی تھا۔“

”وہ بابو لوگ مائی کو لے گئے؟“

”جی نہیں ہم سے پوچھ پوچھ کر ایک کاغذ پر کچھ لکھتے رہے۔ میرے پوچھنے پر بتایا کہ سرکاری لوگ ہیں۔“

”پھر مائی کو کون لے گیا؟“

”میرا گبیٹر ہے‘ اللہ جانے ٹھیک ہے یا غلط‘ مائی کو جو لوگ لے گئے‘ وہ ٹھیکیدار کے آدمی ہوں گے۔ آپ کو تو معلوم ہو گا کہ بھکاریوں کے بھی ٹھیکیدار ہوتے ہیں۔“ چھابے والے نے بتایا۔ میں نے کہا کہ ہاں مجھے معلوم ہے۔ اس سے پہلے کہ سرکاری آدمی اوپر سے منظوری لے کر مائی کو دارالامان لے جاتے‘ رات کو ٹھیکیدار کے آدمی چپکے سے مائی کو اُڑا لے گئے۔

گھر آ کر میں نے اپنی والدہ کو بتایا کہ مائی شیڈ سے چلی گئی ہے‘ تو میں نے ان کے چہرے پر اطمینان کی ایک کیفیت دیکھی۔ ”چلو! بے چاری کی مصیبت ختم ہوئی۔“ وہ بولیں۔ میں نے انہیں یہ بتانا مناسب نہ جانا کہ لاہور میں اور بھی بہت سے بس سٹاپ ہیں او وہاں شیڈ بھی بنے ہوئے ہیں۔ کیا پتہ بے چاری مائی کا ٹھکانا بدل گیا ہو۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ لوگ سردیوں کی ہلکی ہلکی پھوار میں بھی شیڈ سے باہر

کھڑے ہیں اور بڑبڑا رہے ہیں اور اب کے پورے شیڈ پر ایک خوش پوش گوری چٹی سفید بالوں والی بڑھیا کا قبضہ ہے۔ فرش پر اس کا بستر بچھا ہوا تھا۔ سرہانے گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔ سیمنٹ کے بینچوں پر گدّے پڑے تھے نہایت صاف ستھرے اور خوش رنگ۔ شیڈ کی کھلی سائیڈ سے ہلکی ہلکی بوچھار اندر آنے لگی تو بڑھیا نے بستر نہایت سلیقے سے ایک ہولڈال میں لپیٹ کر بینچ پر رکھ دیا۔ ہولڈال واٹر پروف تھا۔ اس نے ایک صندوقچی بستر پر رکھ دی۔ اس پر جلی قلم سے لکھا تھا۔ "خیرات نہیں خراج" اور خود نہایت تمکنت سے گرم شال اوڑھ کر گدّے پر بیٹھ گئی۔ اس پُر تمکین بڑھیا کو دیکھ کر کسی کو شیڈ کے اندر قدم رکھنے کی جرات نہ ہوئی۔

کچھ دنوں بعد ایک نہایت دلچسپ رپورٹ اخبار میں شائع ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ اس شاہانہ وقار کی مالک بڑھیا کا تعلق خاندانِ مغلیہ سے ہے۔ صرف یہی نہیں، وہ بہادر شاہ ظفر کی جانشین ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس کے خاندان کے جو محلات دہلی اور آگرہ میں تھے اور جنہیں ہندوستان کی حکومت نے غصب کر لیا ہے، ان کے بدلے میں انہیں اوّل تو پورا قلعہ ء لاہور ورنہ کوئی ایک محل تو ضرور الاٹ ہونا چاہئے تھا۔ "جب تک ہمیں کوئی محل الاٹ نہیں ہوتا ہم بس سٹاپ کے اس شیڈ میں مقیم رہیں گے۔" لیکن ایک دن شہزادی گوہر بانو کو بھی یہ شیڈ خالی کرنا پڑا۔ میں نے کوئی ایسی خبر نہیں پڑھی کہ شاہزادی والا تبار کو شیش محل الاٹ ہو گیا ہو۔ حالانکہ ہو جاتا تو کوئی ہرج بھی نہیں تھا۔ مدتوں سے یہ محل خالی ہے اور اپنے مکینوں کا انتظار کر رہا ہے۔

تب میں ریٹائر ہو گیا۔ مجھے پونچھ ہاؤس کا سرکاری گھر چھوڑنا پڑا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں نے ریٹائرمنٹ سے پہلے علامہ اقبال ٹاؤن میں گھر بنا لیا تھا۔ ریٹائر ہونے سے پہلے سرکاری گھر بھی اپنا گھر محسوس ہوتا ہے اور ریٹائر ہونے کے بعد اپنا گھر بھی "دارالامان" معلوم ہونے لگتا ہے یا ایک عارضی ٹھکانا کہ جہاں جی نہیں لگانا چاہئے۔ یہی

ہمیں بزرگوں نے سکھایا ہے۔ یوں بھی اس عمر میں گھڑیال کی یہ منادی صاف سنائی دینے لگتی ہے کہ

گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

تاہم ریٹائرمنٹ کے بعد بھی مجھے ہر مہینے چوبرجی چوک آنا پڑتا تھا کہ یہاں کے ایک بینک میں مجھے ہاؤس بلڈنگ فائی نانس کارپوریشن کے قرضے کی قسط جمع کروانا ہوتی تھی۔

جب میں بس سے اترا تو میں نے دیکھا کہ شیڈ پھر سے آباد ہو گیا ہے۔ قسط جمع کرا کے میں اس شیڈ کے اندر بینچ پر بیٹھ گیا۔ یہاں سے میں نے کچہری کی بس لینی تھی کیونکہ پنشن کے سلسلے میں گورنمنٹ ٹریژری بھی جانا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس شیڈ کا تیسرا مقیم نہ بھکاری تھا' نہ شہزادہ۔ ایک بوسیدہ سی دری کے اوپر ایک گدا بچھا تھا۔ ایک چادر اس کے سرہانے تکیے پر پڑی تھی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ وہ پاجامے کرتے میں ملبوس تھا۔ اس کا لباس دُھلا ہوا اور صاف ستھرا تھا۔ شیو ایک دن کی بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر بھکاریوں والی مسکنت یا ڈھٹائی نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے چہرے کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ یہ بس سٹاپ یا سڑک' کسی بینک یا کسی دفتر میں کھڑے ہونے والے ہجوم کا ایک فرد نظر آتا تھا۔ ہجوم میں میرا چہرہ بھی دوسروں کو ایسا ہی لگتا ہو گا' خاصا مانوس اور شناسا سا۔ نہ جانے اس پر کیا افتاد پڑی کہ ہجوم سے یا میری سوچ سے نکل کر میرے سامنے شیڈ کے فرش پر آ بیٹھا۔ اس لمحے مجھے یوں لگا جیسے وہ ایک مدت سے میرے چہرے پر آنکھیں جمائے بیٹھا ہے۔

یہ ایک لمحہ تھا جو کبھی کبھار آتا ہے کہ جب دو آدمیوں کے خیالات کی فریکوئنسی (Frequency) ایک ہو جاتی ہے۔ ایک کتاب کا کوئی ورق آنکھوں کے سامنے کُھل جاتا ہے کہ جو ایک نظر میں پڑھا بھی جا سکتا ہے اور نہیں بھی پڑھا جا سکتا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے کوئی بات کی۔ میں نے سمجھا' وہ خیرات مانگتا

ہے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس نے غوں غاں کر کے مجھے روک دیا۔ بائیں ہاتھ سے اس نے گھڑے کی طرف اشارہ کیا۔ میں اٹھا اور گھڑے کے دہانے پر پڑے ہوئے پیتل کے خاصے وزنی پیالے میں کہ جس پر کچھ نقش و نگار بھی کھدے ہوئے تھے اور ایک گھر میں کثرت سے استعمال ہونے کی وجہ سے جس کی قلعی پھیکی پڑ چکی تھی' میں نے پانی انڈیلا اور پیالہ اسے پیش کیا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے پیالہ پکڑا۔ وہ چھلکنے لگا۔ میں نے پیالہ اس کے منہ سے لگا دیا۔ اس نے دو چار گھونٹ بھرے اور سر ہلا دیا۔ میں نے سوچا "دو چار گھونٹ پینے کے لئے اس نے مجھ سے یہ خدمت کیوں لی؟" بہر حال میں نے باقی ماندہ پانی پھینک کر پیالہ گھڑے پر رکھ دیا۔ میں بینچ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس نے پھر میری نظروں سے نظریں ملائیں۔ ان نگاہوں میں نہ مجھے شکریہ نظر آیا' نہ بے کسی و بے بسی کی وہ کیفیت جس میں بغاوت اور ناراضگی کی چمک ہوتی ہے بلکہ وہ شرر بھی کہ جس سے پوری دنیا میں آگ لگ جائے۔ ممکن ہے کہ یہ میرا اپنا ہی خیال ہو لیکن میں نے یہی سمجھا کہ وہ مجھ سے کہہ رہا ہے۔ "جاتے ہوئے یہ خیال دل میں لے کر نہ جانا کہ میں بھکاری ہوں۔" میں نے چاہا کہ ایک دو سکے اس کی کشکول میں ڈال دوں لیکن میرے ہاتھ نے جیب کی طرف بڑھنے سے انکار کر دیا۔

اگلی بار جب بس سے اترا تو دیکھا کہ شیڈ خالی ہے۔ میں نے چھابے والے سے پوچھا "معلوم ہوتا ہے کہ اس معذور کو دارالامان والے لے گئے؟"

"نہیں میاں جی ! دارالامان والے نہیں ایک بی بی اسے آ کر لے گئی۔"

میں حیران ہوا تو چھابے والے نے بتایا کہ دس بارہ دن ہوئے ایک برقع پوش عورت آئی اور بابے کو گلے لگا کر رونے لگی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بابے کی بیٹی ہے۔ بابا کسی جگہ کوئی کام کرتا تھا' فالج ہو گیا تو بیٹا اسے شیڈ میں چھوڑ گیا۔ "میاں جی! ایسی مصیبت میں بیٹیاں ہی کام آتی ہیں۔" چھابے والا بولا۔ میں نے کہا ہاں اگر اولاد نالائق نکلے تو ٹھیک ہے' ایسا ہی ہوتا ہے۔ "مجھے تو بابے کے بیٹے پر بہت غصہ آیا۔ سوچا کہ

آج کی اولاد کا خون کتنا سفید ہو گیا ہے۔ کیا پتا جب میں کام کاج سے جاتا رہوں' تو میری اولاد بھی مجھے یہاں پھینک جائے۔" چھابے والے نے کہا۔

"اللہ اللہ کرو بھائی! ساری اولاد ایسی نہیں ہوتی۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"وہ بی بی اکیلی تھی؟" میں نے پوچھا۔

اصل میں میرے دل میں شک کا اکھوا پھُوٹ نکلا تھا۔ کیا پتا وہ برقع پوش بی بی بھی بھکاریوں کے گروہ کی کوئی عورت ہو۔

"نہیں جی! اُس کے ساتھ اُس کا پندرہ سولہ سال کا بیٹا بھی تھا۔ بابے سے گلے ملا تو اُس نے اِس کا منہ چوما۔ لڑکا ٹیکسی لایا تو میں نے اُس کی مدد کی اور بابے کو ٹیکسی میں بٹھایا۔ بابے کے چہرے پر خوشی دیکھ کر میرا جی بھی بہت خوش ہوا۔ نیک بیٹی باپ کو لے گئی اور اس کا سامان شیڈ ہی میں چھوڑ گئی۔ اس دن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میرا سودا بھی دیر سے بِکا اور میں جی سے بھی چاہتا تھا کہ بابے کے بیٹے کو دیکھ لوں اور اسے کچھ لعنت پھٹکار بھی کروں۔ رات کو وہ دیر بعد آیا اور چوروں کی طرح دبے پاؤں شیڈ میں داخل ہوا۔ بابے کو وہاں نہ پا کر وہ حیران پریشان ہو گیا۔ میں نے کہا۔ بابو! اب کسے ڈھونڈتے ہو۔ بابے کی بیٹی آئی اور اُسے لے گئی۔ سامان اٹھاؤ اور چلتے بنو۔ ویسے تیرے جیسا بیٹا بھی خدا کسی کو نہ دے۔ میں جی ہی جی میں ڈر رہا تھا کہ وہ کوئی مسٹنڈا ہو گا۔ میری بات کا غصہ کر کے میرے گلے پڑ جائے گا یا دو چار سنا دے گا۔ وہ چونکا ضرور پر اس نے میری طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اُس نے چُپ چاپ بابے کا سامان سمیٹا اور پیالے میں پڑی خیرات جیب میں ڈالی۔ جانے سے پہلے اُس نے مجھے ایک بار دیکھا۔ بابو جی! پتہ نہیں مجھے کیا ہوا کہ میرا غصہ شوں شوں بُجھ گیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اچانک ایک کار کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑی تو وہ مجھے ہلدی کی طرح زرد نظر آیا۔ اُس کے چہرے پر مجھے کوئی پھٹکار بھی نظر نہ آئی نہ وہ کسی بدمعاش کا چہرہ تھا۔ بدمعاشوں کے چہرے اور ہی طرح کے ہوتے ہیں بابو جی! پر میں سوچتا ہوں

وہ اپنے باپ کو شیڈ میں کیوں پھینک گیا؟" میں بھی سوچ میں پڑ گیا کہ چھابے والے کے سوال کا کیا جواب دوں۔ مجھے افسانہ "کفن" یاد آ گیا۔ "کفن" کی بھی بہت سی صورتیں ہیں لیکن اس حوالے سے میں چھابے والے سے کیا کہتا۔ اس نے افسانہ "کفن" کہاں پڑھا ہو گا! اتنے میں میری نظر گھڑے پر جا پڑی جو شیڈ کے ایک کونے میں سُوکھ رہا تھا۔ "بابے کا بیٹا تو گھڑا شیڈ ہی میں چھوڑ گیا؟" میں نے اس کی توجہ ہٹانے کے لئے کہا۔ تاہم میرے لہجے میں طنز بھی تھی۔

"میاں جی ! اچھا کیا کہ چھوڑ گیا۔ کل کو کوئی اور بابا آ گیا تو اس کے کام آئے گا۔"

چھابے والے نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

(نومبر ۱۹۹۷ء)



پہیّا

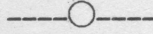
میرا بھتیجا مدثر رضا کہانی سننے اور کہانی کہنے کا خاصا ذوق رکھتا ہے' حالانکہ وہ ایک کالج میں بائی آلوجی پڑھاتا ہے۔ مجھ سے ملنے آتا ہے تو کبھی کبھار کوئی واقعہ سنا کر پوچھتا ہے "اباجی! اس موضوع پر کہانی لکھی جا سکتی ہے؟" میں کہتا ہوں "کیوں نہیں؟ لکھی جا سکتی ہے... لکھو۔"

دو چار کہانیاں اس نے لکھی بھی ہیں۔ مجھے بھی دکھائی ہیں' اچھی کہانیاں ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ خوب کو خوب تر بناؤ تو لطف ہے۔ وہ جوان ہے۔ میں اسے کہتا ہوں کہ اپنے زمانے کی کہانی لکھو اور اپنے زمانے کا آدمی بنو۔ افسانہ بھی جدید لکھو اور پی آر کا جدید فن بھی سیکھو۔ ایسی کہانی لکھو جس میں چمک بھی ہو' گلیمر بھی' سماعت خراش بلند آہنگی بھی اور کچھ مانگے تانگے کا فلسفہ اور چُرائی ہوئی دانش بھی۔ مثلاً" تم کسی ایسے جوان کا افسانہ لکھو جو اپنے محلے کی ایک لڑکی بلو کو چاہتا تھا جو ماڈل گرل بن گئی تو وہ پاپ سنگر۔ اس نے ایک گیت لکھا "کنے کنے جانا اے بلّو دے گھر" اور ایک خلقت بلّو کے گھر جانے کو اُمنڈ آئی۔ کوئی غریبی دعوے کا موضوع ملے تو مجھے بخش دیا کرو۔ آج کل گھر میں پڑا رہنے کی وجہ سے میرے ہاں موضوعات کا قحط ہے۔

تب ایک دن اس نے مجھے کرماں والی کا واقعہ سنایا۔ مجھے اس میں کچھ زیادہ افسانوی ممکنات نظر نہ آئیں تاہم ایک عرصے بعد جب اس نے اس واقعے کا تتمہ مجھے سنایا تو میں کچھ چونکا۔

آج مزید ایک عرصے کے بعد ایک جگنو سا چمکا کہ اس موضوع پر ایک سادہ سی

کہانی لکھی جا سکتی ہے۔ میں نے بال پوائنٹ پنسل کی نوک کاغذ سے لگائی تو وہ خود بخود چل پڑی۔ یہ کہانی میں مدثر رضا کی زبانی نہیں لکھوں گا کیونکہ اس طرح زیبِ داستاں کے لئے مجھے گل بوٹے لگانے کی گنجائش نہیں ملے گی۔



وہ آڈھے کے اڈے پر بس سے اترا۔ اس کا سوٹ کیس بہت بھاری تھا۔ آڈھے سے ہوگڑھا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اگر شارٹ کٹ کیا جائے تو ایک میل رہ جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں سفری بیگ ہوتا تو پیدل ہی چل پڑتا۔ چنانچہ اس نے ایک ٹانگے والے سے پوچھا کہ آیا وہ اسے ہوگڑھے پہنچا سکتا ہے؟ اس نے کہا کہ بابو جی! نہیں' یہ سب ٹانگے شہر جاتے ہیں کوئی بھی نہیں مانے گا۔ ذرا ٹھہریے' اگر جیرا یہاں ہو تو وہ آپ کو لے جائے گا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر سڑک کے پار ایک دکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بابو جی! جیرا وہاں بیٹھا ہے۔"

مدثر رضا سوٹ کیس اٹھا کر دکان پر پہنچا اور پوچھا "جیرا کون ہے؟"

"میں ہوں بابو جی!" بینچ پر بیٹھے ایک دُبلے پتلے آدمی نے کہا۔

"کیا تم مجھے ہوگڑھے لے چلو گے؟"

"جی! گولی کدھی تے گھنے کدھے؟ میں چائے پی لوں تو ٹانگہ جوتتا ہوں۔"

دکان والے نے اسے ایک لرزتی کانپتی کُرسی پیش کی جس پر مدثر بیٹھا تو اس کی چیخیں نکل گئیں۔ بہرحال وہ اس کا بوجھ سہار گئی۔ جیرا چائے پی کر اٹھا ہی تھا کہ دکان والے نے آرڈر لئے بغیر چائے کی ایک پیالی بنائی اور اس کے سامنے بینچ پر رکھ دی۔

"یہ میرے لئے ہے؟" مدثر نے پوچھا۔

"جی!" ہوٹل والا بولا۔

"لیکن میں نے آرڈر تو نہیں دیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں بابو جی! آپ ہمارے مہمان ہیں۔" ہوٹل والے نے کہا۔

مدثر رضا کو چائے کی پیالی سے گھر کے دودھ کی خوشبو آئی۔ اس نے ایک گھونٹ بھرا اور کہا "یار! چائے بہت اچھی ہے۔"

ہوٹل والا بہت خوش ہوا۔ چائے پی کر مدثر نے اسے چار روپے دیے تو وہ کہنے لگا "رہنے دیجئے! بابو جی!"

مدثر کے اصرار پر اس نے روپے قبول کر لئے۔ اتنے میں جیرا ٹانگہ دکان پر لے آیا۔ "آیئے بابو جی!" اس نے کہا۔

مدثر نے ٹانگے اور جانور کی ہیئت کذائی دیکھی تو تذبذب میں پڑ گیا۔ "یا اللہ! یہ ٹانگہ ہے یا ٹانگے کا پنجر اور جو جانور اس کے آگے جُتا ہوا ہے' وہ زندگی اور موت کی کس منزل پر ہے کہ نہ زندہ معلوم ہوتا ہے' نہ مُردہ اور ٹانگہ بان بھی اسی قبیلے کا ایک فرد ہے کہ ہوا کا جھونکا آئے تو اُڑ جائے۔" اس نے پوچھا "بھائی جیرے! تمہارا جانور ہوگڑھے پہنچ جائے گا؟"

"کیوں نہیں بابو جی! ابھی کرماں والی ایک سواری کوٹلی امیر علی پہنچا کر آئی ہے۔ خدا خیر رکھے تو ہوگڑھے بھی پہنچ جائے گی۔" جیرا بولا۔

کوٹلی امیر علی اڈے سے مغرب کی طرف ہے' یہی میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر اور سڑک پکی ہے۔

"یہ کرماں والی کون ہے؟" مدثر نے سوچا اور پھر خود بخود سمجھ گیا کہ ٹانگے میں جتا ہوا جانور گھوڑا نہیں' گھوڑی ہے اور یہ اس کا نام ہے۔

"بھائی جیرے! کرایہ کیا لو گے؟"

"جو آپ دے دیں گے بابو جی!"

"نہیں! طے کر لینا بہتر ہے۔"

ہوٹل والے نے کہا "بابو جی! ہوگڑھے اور کوٹلی امیر علی کا کوئی کرایہ مقرر نہیں۔ سواری خوش ہو کر جو دے دے جیرا لے لیتا ہے۔"

"چلو! تم ہی طے کر دو۔"

"بیس روپے دے دیجئے گا۔"

"بیس روپے زیادہ نہیں؟" مدثر رضا نے پوچھا۔

"بابو جی! ہوگڑھے سے واپسی پر اسے کوئی سواری نہیں ملے گی۔ وہاں لوگ ایمن آباد روڈ سے سیالکوٹ جاتے ہیں۔ کوٹلی امیر علی والے آڈھے کے اڈے سے سیالکوٹ جاتے ہیں۔ وہاں سے آتے ہوئے بھی سواری مل جاتی ہے۔ سواری دس روپے بھی دے دے تو جیرا لے لیتا ہے۔" ہوٹل والے نے جیرے کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔

"بھائی جیرے! تم ایک ہی سواری بٹھاتے ہو؟" مدثر نے پوچھا۔

"جی! کبھی دو بٹھانی پڑیں تو میں ٹانگے میں نہیں بیٹھتا۔ ٹانگے کا بم پکڑ کر کرماں والی کے ساتھ ساتھ چلتا ہوں۔"

"مجھے بیس روپے منظور ہیں۔"

جیرے نے سوٹ کیس آگے ہودے میں رکھا اور مدثر کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا تاکہ ٹانگے کا بیلنس قائم رہے۔ مدثر ماشااللہ چھ فٹ کا صحت مند جوان ہے۔ بیٹھا تو ٹانگہ الار ہو گیا۔ جب جیرا راسیں ہاتھ میں تھام کر اگلی سیٹ پر بیٹھا تو ٹانگہ الار کا الار ہی رہا۔ اس نے سوٹ کیس سیٹ پر رکھا اور خود پائیدان پر پاؤں ٹکا کر بیٹھ گیا۔ ٹانگے کا بیلنس ٹھیک ہوا تو اس نے کہا "بُوٹے یار! ذرا پہیا تو مار۔" بوٹے نے پہیا مارا تو کرماں والی بھی ناچار اپنی جگہ سے ہل پڑی۔ جونہی اس کا رُخ ہوگڑھے کی طرف ہوا تو مدثر نے محسوس کیا کہ کرماں والی کی چال سے کھچاوٹ دُور ہو گئی اور کچھ چونچالی بھی آ گئی ہے۔ مدثر پہلو بدل کر بیٹھا کہ جیرے سے بات چیت ہو سکے۔

اس نے پوچھا "بھائی جیرے! کرماں والی کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ اڈّے سے نکلے اور اب وہ چلنے پر یکایک راضی ہو گئی ہے۔"

"بابو جی! اس کا خیال ہے کہ ہم صرف بیڑھ تک جا رہے ہیں۔"

"بیڑھ تک .... کیا مطلب؟"

"بابو جی! میں اور کرماں والی بیڑھ کے رہنے والے ہیں۔"

بیڑھ سامنے نظر آ رہا تھا۔ کچھ لمحوں بعد جیرے نے رُخ موڑ کر پوچھا "مجھے پوچھنا یاد ہی نہ رہا کہ آپ ہوگڑھے میں کس کے ہاں جائیں گے؟"

"یہ پوچھنا ضروری ہے؟"

"ضروری تو نہیں بابو جی! پر پوچھنے میں کوئی ہرج بھی تو نہیں۔"

"میں پیر شفقت شاہ کے ہاں جا رہا ہوں۔"

"آپ کے کیا لگتے ہیں؟"

"میرے ماموں ہیں۔" مدثر نے کہا۔

"پیر جی! یہ آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا؟" جیرا بولا۔

"پہلے بتا دیتا تو پھر کیا ہوتا؟"

"پیر بادشاہ! میں آپ کو چائے پلواتا۔ کچھ تو خدمت کرتا۔ آپ کی طرف پیٹھ کر کے نہ بیٹھتا۔ ہم تو اس خاندان کے جدی پشتی مرید ہیں۔ بیڑھ کے سیّد اور ہوگڑھے کے سیّد ایک ہی ہیں۔"

"ہاں! ایک ہی ہیں۔" مدثر نے اس کی تصدیق کی۔

پھر اس کی توجہ کرماں والی کی طرف مبذول ہو گئی۔ جو نہ پویا چل رہی تھی، نہ دُلکی۔ یہ کوئی نرالی چال تھی۔ ڈھچکوں ڈھچکوں، ٹیڑھی میڑھی، لڑکھڑاتی ہوئی۔ کبھی ٹانگے کا ایک پہیّا کچے پہ چلا جاتا، کبھی واپس پکے پہ۔ کرماں والی کے پنجر سے کڑکڑ کی آواز بھی آتی۔ سڑک پکی تھی ورنہ ٹانگے کو تو کیا، کرماں والی اپنے آپ کو بھی نہ کھینچ سکتی۔ اُسے کرماں والی پر اچانک بہت رحم آیا اور یہ خیال بھی کہ وہ اُس پر ظلم کر رہا ہے۔ اُس نے کہا "بھائی جیرے! میں ٹانگے سے اُتر کر ساتھ ساتھ پیدل کیوں نہ چلتا

رہوں؟ سوٹ کیس ٹانگے پر سوار رہے گا کیونکہ اسی کے لئے میں نے ٹانگہ کرایا ہے۔"

"نہیں پیر جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کرماں والی کو باہر سے نہ دیکھئے، اندر سے وہ بہت نگرّ ہے۔"

"نگرّ وہ تو باہر سے بھی نظر آتی ہے، بھائی جیرے! ایسی سمارٹ اور سلم گھوڑی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔" مدثر کے طبیعت میں مزاح کا عنصر بھی ہے، اگرچہ جیرے پر اُس کا مزاح ضائع ہی ہو گیا کیونکہ وہ سمارٹ اور سلم کے معنوں سے واقف نہیں تھا۔ تاہم وہ خوش ضرور ہوا کہ یقیناً پیر بادشاہ نے میری گھوڑی کی تعریف کی ہے۔

کچھ عرصہ دونوں خاموش رہے۔ بہت سے پیدل لوگ پیچھے سے آئے اور آگے نکل گئے۔ ایک کمہار کے گدھے جو اینٹیں ڈھو ڈھو کر تھکے ہوئے تھے، وہ بھی ٹانگے کے دونوں طرف سے "کھہ" کر گزر گئے۔ کمہار ایک گدھے پر دونوں ٹانگیں ایک طرف کر کے بڑی شان بے نیازی سے بیٹھا ہوا تھا۔ پاس سے گزرا تو کہنے لگا "یار جیرے! کیا چال ہے تیری بکّی کی؟"

"تیری کانی گدھی سے تو اچھی ہے پُترا!"

معلوم ہوا کہ کمہار جس گدھے پر سوار تھا، وہ گدھی تھی اور کانی بھی۔ لیکن کانی گدھی بھی کرماں والی سے آگے نکل گئی۔

مدثر نے بات چیت کا سلسلہ پھر جوڑنے کے لئے کہا "بھائی جیرے! تم کرماں والی کی چھُٹی کیوں نہیں کر دیتے؟"

وہ کوئی جواب دینے والا تھا کہ اُس پر کھانسی کا دَورہ پڑ گیا۔ وہ دیر تک کھانستا رہا۔ پھر صافے کے پلّو سے اُس نے منہ پونچھا اور اُس کی طرف ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا "جی تو میرا بھی چاہتا ہے کہ کرماں والی کی چھُٹی کر دوں پر کھاؤں کہاں سے؟ کرماں والی روز کے چالیس پچاس کما لیتی ہے اور آدھے سے زیادہ خود کھا جاتی ہے۔ باقی دس بیس جو بچتے ہیں اپنے خرچ کے لئے رکھ لیتا ہوں۔ پیر جی! میں بیمار

ہوں۔ روز کے روز آڈھے کے ڈاکٹر سے پندرہ بیس کی دوائی خرید تا ہوں۔"

"تو کھانے کے لئے کیا بچتا ہو گا؟" مدثر نے پوچھا۔ پھر کہا "بھائی جیرے! یہ کیوں نہیں کہتے کہ کرماں والی کی چھٹی کر دوں تو دوا دارو کے لئے پیسے کہاں سے لاؤں؟"

"ٹھیک کہا پیر بادشاہ! بس یہی سمجھ کہ کرماں والی میری جند جان ہے۔"

"کوئی زمین وین نہیں تمہارے پاس؟"

"ہے! آدھی پیلی۔ بڑا بھائی واہی بیجی کرتا ہے' اُس کے پاس ہے۔ اُس کے ہاں سے دو وقت کی روٹی مل جاتی ہے۔"

اتنے میں بیڑھ آ گیا اور کرماں والی سڑک کے کنارے ایک جگہ خود بخود رُک گئی۔

جب گاؤں کا اشتمال ہوا تھا تو گاؤں کے گرداگرد پھرنے والی سڑک کے اندر کہ جسے پھِرنی کہتے ہیں کچھ زمین سکونت کے لئے رکھی گئی تھی جہاں محلہ آباد ہو گیا تھا۔

جیرے نے ٹانگے سے اتر کر کرماں والی کو تھپکی دی جیسے وہ کالے کوسوں کا فاصلہ طے کر کے آئی ہو۔ آڈھے سے بیڑھ چار پانچ فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ مدثر ٹانگے سے اُتر گیا۔

جیرے نے کہا "پیر بادشاہ! یہ جو سامنے پکا مکان ہے میرے بڑے بھائی کا ہے اور یہ جس کوٹھڑی پر تالا لگا ہے' میری ہے۔"

اس کوٹھڑی کے سامنے برآمدہ تھا اور سڑک تک جو دو چار فٹ چوڑا صحن تھا' اس میں بہت کیچڑ تھا۔ اصل میں ایک دو دن پہلے بارش ہوئی تھی اور ابھی کچے صحن سوکھے نہیں تھے۔ یہ اوائل جنوری کی سہ پہر تھی اور اردگرد کے ماحول پر دھوپ خوب نکھر کر چھائی ہوئی تھی۔ کھیتوں میں گندم کے پودے ابھی ہاتھ دو ہاتھ سے زیادہ بلند نہیں ہوئے تھے لیکن دُور تک ایسا لگتا تھا جیسے سبز مخمل کا ہموار فرش بچھا ہوا ہو۔ کہیں

کہیں سرسوں اور گنے کے کھیت تھے' ابھی سرسوں پھولی نہیں تھی۔ مدثر کو یہ منظر اچھا لگا۔ اگر کوئی کیمرے والا ساتھ ہوتا تو وہ اس پس منظر میں کرماں والی اور ٹانگے کے ساتھ اپنی تصویر ضرور کھنچواتا۔ جیرے کو بھی ساتھ کھڑا کر لیتا۔ یہ ایک یادگار تصویر ہوتی۔

"پیر بادشاہ! کچھ چائے پانی ہو جائے؟" جیرے نے صُلا ماری۔

"نہیں یار! اب چلنا چاہئے۔"

"پیر ممتاز شاہ' پیر سبطین شاہ سے نہیں ملیں گے؟"

"آج نہیں۔ کل آ کر مل لوں گا۔"

"کرماں والیئے! تو نے کچھ ریشٹ کر لی ہے۔ چل اب پیر بادشاہ کو ہوگڑھے پہنچا آئیں۔"

کرماں والی نے کان کھڑے کر لئے اور گدلی گدلی کیچ بھری آنکھوں سے اسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو' چلنے کو جی تو نہیں چاہتا پر تو کہتا ہے تو مجبور ہوں۔ جیرے نے کچھ فاصلے پر کھڑے ایک آدمی کو آواز دی "گامے! ذرا پہیا تو مار۔ پیر بادشاہ! آپ بیٹھ جائیں۔"

جب جیرا راسیں ہاتھ میں لے کے پائیدان پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا تو گامے نے پہیّا مارا اور کرماں والی مومنٹم میں آ گئی۔

سڑک پر جا بجا کھڑے بچے کرماں والی کو دیکھتے تو تالیاں بجاتے جیسے وہ تماشا ہو۔ ہر موڑ سے پہلے بہت بے ڈھنگا سا سپیڈ بریکر بھی بنا ہوا تھا۔ کرماں والی یہاں خود بخود سڑک کا کنارہ اختیار کر لیتی۔ ایک موڑ پر ایک پہیّا سپیڈ بریکر پر چڑھ گیا اور ٹانگے کا توازن اچانک بگڑ گیا۔ مدثر سڑک پر لڑھکتے لڑھکتے بچا۔ یہاں کچھ مٹیاریں بھی "کاکا سُپر سٹور" پر کھڑی سودا لے رہی تھیں۔ انہوں نے بھی تالیاں بجائیں تو مدثر کچھ جھینپ سا گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے بھائی جیرے' اُس کے ٹانگے اور کرماں والی کی مثلث چوکور بن

گئی ہو یا تصویر میں کسی چوتھی بُعد کا اضافہ ہو گیا ہو۔ "اب تو شہروں کی آزادہ روی دیہات میں بھی پہنچ گئی ہے۔" اس نے ردّعمل کے طور پر سوچا اور آنکھ اٹھا کر دیکھا تو اسے اکثر چھتوں پر اینٹینے لگے ہوئے دکھائی دئے۔ "یہ مٹیاریں پاپ سنگروں کو گاتے بجاتے، ناچتے کودتے بھی دیکھتی ہوں گی۔"

"بھائی جیرے! بیڑھ تو بہت ماڈرن ہو گیا ہے۔"

"پیر بادشاہ! مڈرن کیوں نہ ہو! گھر گھر فینسی لائٹیں بنائی جاتی ہیں۔ سیالکوٹ سے ڈسکے تک بڑی سڑک پر کارخانے ہیں۔ لوگوں کو آسانی سے مزدوری مل جاتی ہے۔ سمجھ لو! حالت ہی بدل گئی ہے۔"

"پر بھائی جیرے! تیری حالت تو نہ بدلی۔"

"پیر بادشاہ! میری حالت کیا بدلتی۔ میں جماندرو روگی، دمے کا مارا ہوا۔ پھیپھڑے کمزور ہیں۔ ہر سال سردیوں میں نمونیئے کا خطرہ رہتا ہے۔ بچپن میں نمونیئے سے کئی بار مرتے مرتے بچا۔ چوتھی جماعت تک پڑھا بھی۔ پڑھنے میں اچھا تھا پر ایک تو بیمار، دوسرے غریبی۔ مجھے آگے کون پڑھاتا؟"

"شادی بھی نہیں ہوئی؟" مدثر نے پوچھا۔

"روگی کو کون لڑکی دیتا ہے بھولے بادشاہ! اچھا ہوا۔ کوئی بال بچہ ہوتا تو کیسے پالتا پوستا؟"

"عمر کتنی ہے؟"

"عمر وہی ہوتی ہے جو چہرے مہرے سے نظر آتی ہے۔ تم میری بات پر اعتبار نہیں کرو گے۔ خود ہی اندازہ لگا لے پیر بادشاہ!"

"یہی پینتالیس پچاس سال۔" مدثر نے کہا۔

"ٹھیک ہے پیر بادشاہ۔"

"کرماں والی کی عمر کیا ہے؟"

"اس جناور کو اللہ تعالیٰ نے بہت کم عمر دی ہے۔ ہو گی دس بارہ سال۔"

"کمزور بہت ہے۔"

"جو روگ مجھے ہے' وہی اسے بھی ہے۔ دمے کی وجہ سے دوڑ نہیں سکتی۔ بیچاری کے پھیپھڑے بہت کمزور ہیں۔ اکثر اسے سردی لگ جاتی ہے۔ پچھلے سال نمونیا ہو گیا۔ ہسپتال لے گیا۔ وہاں بے رحمی والے بھی پہنچ گئے۔ ڈاکٹر سے اجازت لے کر اسے گولی مارنے والے تھے کہ میں نے سینہ آگے کر دیا اور کہا "جمعدار! اسے گولی مارنے سے پہلے مجھے گولی مار دے۔" بے رحمی والے کسی پر رحم نہیں کھاتے پر نہ جانے اُس کے دل میں کیسے رحم آ گیا۔ سمجھا ہو گا کہ اس نے مرنا تو ہے' چلو نمونیئے سے مرنے دو۔ اللہ کی قدرت ہے کہ اُس دن سے لے کر آج تک کے دن تک یہ تندرست ہے۔ میں اس کا بہت خیال رکھتا ہوں۔ سردیوں میں اسے کوٹھڑی کے اندر باندھتا ہوں' خود برآمدے میں سوتا ہوں۔"

"اندر گنجائش نہیں؟" مدثر نے پوچھا۔

"پیر بادشاہ ایک چارپائی کے لئے تو جگہ نکل آتی ہے لیکن کرماں والی ہے تو ایک جناور ہی۔ لید پیشاب بھی تو کرتی ہے' روز بستر تر بتر ہوتا رہے۔"

"برآمدے میں سردی تو لگتی ہو گی؟"

"پیر بادشاہ! آج کل پالے کُہرے والی سردی کہاں پڑتی ہے۔ کبھی گھڑوں میں پانی جم جایا کرتا تھا۔ اب جمتا ہے کیا؟ جُلّے تلائی میں پوری روئی بھری ہوئی ہو تو پالے کا کیا کام۔"

"ایک بے زبان کے لئے جو تو قربانی کرتا ہے بھائی جیرے! اس کا اجر تجھے ضرور ملے گا۔"

"پیر بادشاہ تیرے منہ سے نکلا ہے تو ٹھیک ہی ہو گا پر میں جو کچھ کرتا ہوں' کرماں والی کے لئے تو نہیں کرتا' اپنے لئے کرتا ہوں۔"

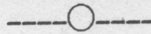
"جیرے نے کتنی سچی بات کہہ دی ہے۔" مدثر نے سوچا۔

اتنے میں ہوگڑھا آ گیا۔ آدھے گاؤں کے گرد گھوم کر جیرے نے پیر شفقت شاہ کے ٹیوب ویل کے سامنے ٹانگہ کھڑا کر لیا۔ وہ ٹانگے سے اتر کر ٹیوب ویل سے بیس پچّیس قدموں کے فاصلے پر مدثر رضا کے نانا پیر مسکین حسین شاہ مرحوم کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے چلا گیا۔ اس کے واپس آنے سے پہلے مدثر کا ماموں زاد پیر پارو شاہ نے سُوٹ کیس سیٹ سے اتار لیا تھا۔

جیرے نے کہا "خدا بخشے پیر مسکین حسین شاہ بڑا سوہنا اور سخی سید تھا۔" مدثر رضا نے پچاس کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ کچھ لمحوں تک نوٹ کو دیکھتا رہا۔ اس کے پاس شاید باقی روپے پُورے نہ تھے۔

مدثر نے کہا "مہربانی کر کے جیب میں ڈال لو۔"

اس سے پہلے کہ اس کا تشکر سے لبریز جذبہ آنکھوں سے ٹپک کر اس کے ہونٹوں پر آتا، مدثر نے کہا "بھائی جیرے! تیرا بھی اور تیری کرماں والی کا بہت بہت شکریہ۔ اب راسیں ہاتھ میں لے کر سیٹ پر بیٹھ جا۔ پہیا میں ماروں گا۔"



اس سے اگلے سال آڈھے کے اڈّے پر وہ بس سے اُترا تو اس کے ہاتھ میں ایک ہلکا سا بیگ تھا۔ اب کے وہ پگڈنڈیوں کا سفر کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق سے یہ بھی اوائل جنوری کی ایک سہ پہر تھی۔ اگرچہ اُس سال پہلے سے کہیں زیادہ سردی پڑ رہی تھی، دیہات میں پالا کُہرا بھی پڑتا ہو گا اور ممکن ہے کہ صحن میں گھڑونجی پر رکھے گھڑوں میں پانی بھی جم جاتا ہو گا تاہم ابھی تک فضا میں خوشگوار سی تمازت رچی ہوئی تھی اور سبز مخمل کے فرش پر بچھی ہوئی سبزی مائل دھوپ کی چاندنی آنکھوں کو بھلی لگ رہی تھی۔

چائے والے کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے اچانک خیال آیا کہ کیوں نا کرماں والی اور جیرے کے متعلق پوچھ لوں۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تھی

اور اسے جیرے کا ٹانگہ نظر نہ آیا تھا۔

چائے والے نے اُسے وہی لرزتی کانپتی کرسی پیش کی اور آرڈر لئے بغیر ایک پیالی چائے اُس کے سامنے بینچ پر رکھ دی۔ اس بار بھی دودھ گھر کا تھا اور چائے اچھی بنی تھی۔

مدثر نے پوچھا "جیرا اور کرماں والی نظر نہیں آئے؟"

چائے والے نے اُس کے چہرے کو بغور دیکھا اور اُسے پہچان کر کہا "بابو جی! آج تو آپ کے پاس بھاری سوٹ کیس نہیں، آپ پیدل بھی ہو گڑھے پہنچ سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن یونہی خیال آیا کہ جیرے اور کرماں والی کا پوچھ لوں۔"

"وہ دونوں تو گزر گئے بابو جی!"

"کیا مطلب؟ دونوں؟" مدثر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پچھلے دنوں سردی بہت پڑی۔ دونوں کو سردی لگ گئی۔"

"دونوں ایک ہی دن اللہ کو پیارے ہو گئے؟" اُس نے پوچھا اور پھر اُسے اپنے ہونقانہ سے سوال پر کچھ جھینپ سی محسوس ہوئی۔

"ایک ہی دن نہیں، ایک ہی رات کو۔" دکاندار بولا "اللہ کے رنگ نیارے ہیں۔ دن چڑھے جیرے کی بھرجائی نے اُسے کئی آوازیں دیں کہ آکر کھانا کھا لو، وہ نہ آیا تو خود برآمدے میں آئی۔ لحاف سرکایا تو دیکھا کہ پنجرہ خالی ہے اور طوطا اُڑ گیا ہے۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ کسی نے کہا دیکھو تو سہی، کرماں والی کا کیا حال ہے۔ جیرے کا بھائی اندر گیا تو دیکھا کہ وہ بھی گزر گئی ہے۔ شاید آپ کو پتا نہ ہو، جیرا باہر برآمدے میں سوتا تھا اور کرماں والی کو کوٹھڑی میں باندھتا تھا۔"

مدثر کو یہ بات معلوم تھی لیکن اُس نے چائے والے کو بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

اُس کی نظروں کے سامنے وہ منظر پھر گیا جب جیرا ٹانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا

اور اس نے پہیا مارا تھا۔

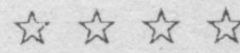
"تو گویا جیرا کرماں والی کی راسیں تھامے اپنے ہی ٹانگے پر اگلے جہان پہنچ گیا۔"
مدثر کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ چائے والے نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا تو مدثر نے پوچھا "بھائی بوُٹے! اب کی بار پہیا کس نے مارا؟"

بوٹا چائے والا مدثر کے سوال پر کچھ عرصہ پریشان سا رہا' آہستہ آہستہ اس کی سوچ جاگی تو اس نے اُس کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو:

"بابوجی! یہ بھی پوچھنے کی بات ہے بھلا؟"

نوٹ: ٹانگہ بان اور اُس کی گھوڑی کے سوا سب نام و مقام اصلی ہیں' البتہ کہانی فرضی ہے۔

(اکتوبر ۱۹۹۸ء)



اپنا گھر

جب مہر دین جاٹ نے کہا کہ وہ زمین اپنے دو بیٹوں میں بانٹ کر مصلّے پر بیٹھ جائے گا تو اُس کی بیوی بولی ''چودھری! تیری مت تو نہیں ماری گئی۔ تو بعد کو پچھتائے گا۔''

''جیناں ! اتنا زمانہ ہو گیا ہے کام کرتے کرتے' اب جی چاہتا ہے کہ آرام کروں۔''

''میری بات گرہ میں باندھ لے چودھری ! آرام جٹ کی قسمت میں لکھا ہی نہیں۔''

میاں بیوی میں یہ مکالمہ ٹیوب ویل پر اس دوپہر کو ہوا جب بھادوں کی دھوپ نے مکّی کے کھیت میں نلائی کرتے ہوئے جاٹ کو بے حال کر دیا تھا اور کھیت کی مینڈھ پر جو پاپلر کے درخت تھے' ان کا سایہ اتنا کم اور سکڑا ہوا تھا کہ اس کا پسینہ بھی نہ سُوکھ سکا تھا۔

کسی اگلے نے سچ ہی کہا تھا کہ بھادوں کی دھوپ نے جٹ کو فقیر بنا دیا تھا۔



اس سے دو چار دن بعد بشیر اور نذیر میں جھگڑا ہو گیا۔ نذیر کا خیال تھا کہ بشیر بڑا بھائی ہونے کے ناتے سے اس سے زیادہ کام لیتا ہے' ٹیوب ویل چلا کر خود دھریک کی ٹھنڈی چھاؤں تلے بیٹھا حقّہ پیتا رہتا ہے اور کھیتوں میں سارے کام مجھے کرنے پڑتے ہیں۔ ناکے میں موڑتا ہوں' کیارے میں بناتا ہوں۔ مونجی کی فصل جسے پانی کی

بہت ضرورت ہوتی ہے، اُس کی دیکھ بھال بھی میں کرتا ہوں۔ لبالب بھرے ہوئے مونجی کے کھیت کی مینڈھ پر کھڑا ہونا اور وہ بھی بھادوں کی دھوپ میں، یوں لگتا ہے جیسے کسی کو گرم بھاپ دی جا رہی ہو، سر سے پاؤں تک بندہ پسینے میں نہا جاتا ہے۔ پانی میں کئی سورج تیر رہے ہوتے ہیں اور چنگاریاں اٹھتی ہیں۔ آنکھوں کی پُتلیاں جلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ایک بار کھیت کو دیکھ لو تو دیر تک آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا رہتا ہے۔

اصل میں سارا فساد بھادوں کی دھوپ کا تھا۔

جہاں جہاں سے پانی رس رہا تھا، وہاں مونجی کے کھیتوں کی مینڈھیں درست کر کے نذیر ٹیوب ویل پر لوٹا تو بشیر دھریک کے سائے میں کھاٹ پر بیٹھے بیٹھے اونگھ رہا تھا۔

نذیر پھٹ پڑا "بھا بشیر! کوئی چھوٹا موٹا کام تو بھی کر لیا کر۔"

بشیر نے یکایک جاگ کر کہا "کیا کہہ رہے ہو نذیر! میں کام نہیں کرتا؟"

"ہاں! دھریک کی ٹھنڈی چھاؤں تلے بیٹھ کر حقہ چھکتے رہتے ہو اور میں کھیتوں میں کھڑا دھوپ میں جلتا رہتا ہوں۔ ذرا دھوپ میں نکل کر تو دیکھو۔"

ابھی دونوں بھائیوں میں تُو تکار شروع نہیں ہوئی تھی کہ نذیراں سر پر روٹیوں کا چھابا رکھے اور ہاتھ میں گھنی لسّی کا ڈول لٹکا کے بھتے ویلا لے کر آ گئی۔ اس کے چہرے پر پسینہ تھا اور پسینے سے غصہ چھلک رہا تھا۔ اس نے کھاٹ پر چھابا رکھا اور ڈول لے کر ٹیوب ویل پر چلی گئی۔ پہلے اس نے ٹیوب ویل کے ٹھنڈے ٹھار پانی سے منہ ہاتھ دھوئے، پھر کوٹھڑی کے اندر سے ایک لمبا سا گلاس نکالا۔ ٹیوب ویل کی تیز دھار سے اس نے گلاس بھر بھر کر ڈول میں ڈالے اور لسی بڑھائی۔ نذیر ایسے ہی دو گلاس اور دھو دھا کر لے آیا۔ نذیراں نے ایک گلاس بھر کر بشیر کو دیا اور کہا "بھا! ایک بات کروں، تو غصے تو نہیں ہو گا۔"

"نہیں نذیراں۔" بشیر نے لسی کا گھونٹ بھر کر کہا۔

"بھا! بہن بشیراں کو سمجھا۔ دن رات منجی پر پڑی رہتی ہے' کچھ ہلا جلا کرے۔ گھر کے سارے کام بھی مجھے کرنے پڑتے ہیں اور باہر کے بھی۔"

"دیکھ نذیراں!" بشیر نے بڑے پیار سے کہا "اس پر وقت بھی تو ایسا ہی آیا ہوا ہے۔ تجھے تو مجھ سے زیادہ پتا ہے۔"

نذیراں نے کچھ جھینپ کر کہا "اسے کچھ تو ہاتھ پیر ہلانے چاہئیں۔ منجی پر پڑی پڑی "مجھ کی مجھ" ہو رہی ہے۔"

"چُپ کر نذیراں!" اس کے خاوند نذیر نے اسے جھڑکا "بشیر میرا بڑا بھائی ہے اور بشیراں میری بڑی بہن۔ گھر میں بہن بشیراں کام نہیں کرتی اور یہاں بھا بشیر۔۔۔ اٹھ بابے کو آواز دے۔"

نذیراں نے کچھ دُور جا کر پکارا "ماماں! آ روٹی کھا لے۔"

نذیراں مہردین کی بھانجی تھی۔

جب مہردین پسینے میں ڈوبا ہوا ٹیوب ویل پر آیا تو تقریباً" نیم بے ہوش تھا۔ نذیراں نے فوراً" لسی کا گلاس بھر کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا "ماماں! تیرا تو بُرا حال ہے۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا کُڑیے!" مہردین نے کہا اور غٹ غٹ لسی کا گلاس چڑھا گیا۔

تب نذیر بولا "بابا! اب تیرے دن کام کرنے کے نہیں۔ تو بھا بشیر سے کیوں نہیں کہتا کہ کام کیا کرے۔"

"بشیر بھی کام کرتا ہے۔"

"ہاں! بہت کام کرتا ہے۔ ٹیوب ویل چلا کر دھریک کی چھاؤں میں بیٹھا رہتا ہے اور حقّہ ٹھونستا رہتا ہے۔"

"بس کر نذیرے ! تو تو ٹوٹے چھتر کی طرح پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے۔" بشیر نے غصے سے کہا۔

"ماماں ! گھر میں بہن بشیراں بھی تو منجی پر بیٹھ کر چودھر کرتی ہے۔" نذیراں بولی۔

"بابا! سنا ! نذیراں کیا کہہ رہی ہے؟" بشیر کے انداز میں غصہ بھی تھا اور گلہ بھی۔

"سن لیا۔" مہردین نے کہا "اب مجھے کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لینا چاہئے--- آؤ اب روٹی کھائیں۔"

تنور کی روٹیاں مکھن سے چپڑی ہوئی تھیں۔ ایک پیالے میں ٹنڈوں کا سالن تھا' ایک میں آم' لسوڑوں اور مرچوں کا اچار۔ ہر ایک کے ہاتھ میں گلاس تھا جس میں ٹھنڈی نمکین لسّی تھی۔ ایک لقمے میں مکھن' سالن' اچار اور لسی کا چہار آتشہ مزہ گھلا ہوا تھا۔ تینوں نے چپ چاپ روٹی کھائی اور بھائیوں کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ بشیر اٹھا۔ اس نے نئی چلم بھری اور ٹیوب ویل سے حقہ تازہ کر کے باپ کے سامنے رکھ دیا۔ نذیراں برتن سمیٹ کر گاؤں کی طرف چلی گئی۔ نذیر حقّے کے دو کش لگا کر کھیت کی طرف چلا گیا اور وہاں سے اس نے اشارہ کیا کہ ٹیوب ویل بند کر دو' کھیت بھر چکا ہے لیکن مہردین نے بشیر کو روک دیا۔ وہ لنگوٹا کس کر ٹیوب ویل کی دھار کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ اگرچہ دوپہر کی دھوپ بہت تیز تھی اور ٹیوب ویل پر کوئی سایہ بھی نہیں تھا لیکن ٹھنڈے پانی نے جسم کی ساری گرمی نکال دی تھی۔

وہ حقے کی نے منہ میں لے کر کھاٹ پر بیٹھ گیا۔

جب نذیر کھیت سے واپس آیا تو دونوں بھائی زمین پر بیٹھ گئے اور باپ کا منہ تکنے لگے۔ "پتہ نہیں بابے نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" مہردین نے پانچ سات منٹ انہیں انتظار میں رکھا۔ پھر کہا "تمہاری ماں سے مشورہ کر لوں تو پھر کوئی فیصلہ کروں گا۔"

"کیا فیصلہ کرو گے؟" دونوں نے بیک وقت پوچھا۔

"ابھی نہ پوچھو۔ جاؤ اندر سے سرہانہ لے آؤ۔"

مہر دین حقے کی نے منہ میں لئے دھریک کے سائے تلے بچھی کھاٹ پر لیٹتے ہی گھوک سو گیا۔ بھادوں کی چھاؤں ٹھنڈی ہوتی ہے، ہلکی ہلکی ہوا بھی چلتی رہتی ہے اور حبس بھی نہیں ہوتا۔

بشیر نے نہایت آہستگی سے حقے کی نے بابے کے منہ سے نکال لی۔



مہر دین عام طور پر ٹیوب ویل ہی پر رہا کرتا تھا۔ ڈھور ڈنگروں کی رکھوالی ضروری تھی۔ بعض اوقات رات کو بھی ٹیوب ویل چلانا پڑتا تھا۔ بشیر اور نذیر گھر چلے جایا کرتے تھے۔ اس شام اس نے بشیر اور نذیر سے کہا کہ آج رات دونوں ٹیوب ویل پر رہیں، میں گھر جاؤں گا۔

مہر دین کو ورثے میں پانچ سات کھیت ہی ملے تھے۔ وہ محنتی آدمی تھا اور اس کی بیوی جزرس۔ اس نے چھ سات کھیتوں کا اضافہ کر لیا تھا۔ اس زمانے میں زمین کی اتنی قدر نہ تھی۔ مہاجر زمین الاٹ کراتے اور اونے پونے بیچ کر کسی دوسرے گاؤں میں چلے جاتے۔ عام طور پر انہیں نہری علاقہ پسند تھا۔ اشتمال ہوا تو آدھا مربع زمین ایک جگہ اکٹھی ہو گئی۔ بجلی آئی تو مہر دین نے ٹیوب ویل بھی لگا لیا۔

اس رات کھلی چھت پر میاں بیوی آپس میں کھسر پسر کرتے رہے اور بشیراں اور نذیراں کان لگائے ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتی رہیں لیکن چھت دو حصوں میں منقسم تھی اور درمیان میں دیوار تھی۔ اس نے جیناں کو آج دوپہر کا قصہ سنایا اور کہا "جیناں! تو بڑی بھاگ والی ہے۔ تو نے مہر دین کے گھر کو جنت بنا دیا ہے پر اب جنت میں نقب لگ چکی ہے۔ دونوں بھائیوں میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ انہیں الگ الگ کر دیا جائے۔"

جیناں رونے لگی لیکن اس کے فیصلے کی تردید نہ کی۔

اگلے دن مہردین نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ دونوں بھائیوں میں زمین برابر برابر تقسیم کر دی۔ ٹیوب ویل کے ساتھ کا چار کنال کا ٹکڑا اپنے پاس رکھا اور ٹیوب ویل بھی اپنی تحویل میں لے لیا کہ کہیں پانی کی تقسیم پر دونوں بھائی لڑتے نہ رہیں۔ ڈھور ڈنگروں کے متعلق طے ہوا کہ بیلوں کی جوگ مشترکہ ہو گی۔ ایک ایک لیری (دودھیل بھینس) بھائیوں کے حصے میں آئی لیکن ایک "جھوٹی" کو جیناں نے اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی میاں بیوی کا بٹوارا بھی ہو گیا۔

مہردین چھوٹے بیٹے نذیر کے حصے میں آیا کیونکہ نذیراں اُس کی بھانجی تھی اور جیناں بڑے بیٹے بشیر کے حصے میں کہ بشیراں اُس کی بھانجی تھی۔

ٹیوب ویل پر جو کمرہ بنا ہوا تھا' اسے لیپ پوت کر نذیراں نے مامے کی مستقل رہائش کے قابل بنا دیا۔ یوں مہردین پہلے بھی اسی کمرے میں رہتا تھا۔ جیناں اسی کوٹھڑی میں مقیم رہی جو میاں بیوی کے لئے مخصوص تھی۔

مہردین کے لئے کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی تھی اور شروع شروع میں جیناں کو بھی کچھ زیادہ فرق محسوس نہ ہوا کہ ڈوئی اس کے ہاتھ میں تھی۔ جب سب اکٹھے تھے تو وہ چولھے چوکے میں بہوؤں کا ہاتھ بٹاتی تھی' کبھی تنور تپا کر روٹیاں بھی لگا لیتی۔ بہوئیں پکا رینھ کر ہانڈی اور چنگیر اس کے سامنے رکھ دیتیں۔ پوتے پوتیاں اس کے اردگرد بیٹھ جاتے۔ وہ روٹیاں چپڑتی' لسی بڑھاتی' پہلے ٹیوب ویل والوں کے لئے کھانا پروستی' پھر پوتے پوتیوں کو کھلاتی اور ان کے بعد بہوؤں کو کھانا دیتی اور سب سے آخر میں خود کھاتی۔ کبھی کبھار یہ ہوتا کہ اس کے لئے سالم روٹی نہ بچتی اور وہ بچوں کے چھوڑے ہوئے ٹکڑے کھا کر پیٹ بھر لیتی۔ دال سبزی کم پڑ جاتی تو اسے کوئی پروا نہ ہوتی۔ وہ لسی سے روٹی کھا لیتی۔ جس کے ہاتھ میں ڈوئی ہو' اسے ایسی قربانیاں دینا ہی پڑتی ہیں۔ ڈوئی حکومت ہے اور حکومت اپنی قیمت بھی مانگتی ہے۔

کچھ عرصے تک بشیراں نے ڈوئی اس کے ہاتھ سے نہ چھینی۔ وجہ یہ تھی کہ اب بشیر کے ساتھ اسے کھیتوں میں کام کرنا پڑتا تھا۔ جب اس کی زچگی قریب آئی تو بشیر نے ایک کاماں رکھ لیا۔

دونوں بھائی اب بہت محنت کرتے تھے اور اپنے اپنے حصے کی کھیتی میں بڑھ چڑھ کر کام کرتے۔ کچھ زراعت بھی آسان ہو گئی تھی۔ گاؤں میں ایک دو ٹریکٹر بھی تھے جو کرائے پر چلتے تھے۔ ٹریکٹر چلوانے کے بعد کھیت میں ایک دو بار ہَل چلا لینے کو بہتر سمجھا جاتا تھا۔ ایک ہی جوگ کو دونوں بھائی باری باری استعمال کر لیتے تھے۔

مہر دین کو کام کی عادت تھی، وہ اکثر اپنی چار کنالوں میں کام کرتا نظر آتا۔ سبزیاں لگانے کا اسے شوق تھا حالانکہ یہ کام ارائیوں کا تھا اور جاٹ سبزی کاشت کرنے میں ہتک محسوس کرتے تھے لیکن اب زمانہ بدل گیا تھا۔ بشیر اور نذیر کو بھی مفت میں سبزی مل جاتی تھی۔

نذیراں اپنے مامے کا بہت خیال رکھتی۔ مامے کو سردیوں میں چائے پینے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اس کے لئے چائے پکا کر گاؤں سے کیتلی میں ڈال کر لاتی۔ اب مہردین نے چائے ٹیوب ویل پر ہی بنانی شروع کر دی۔



جب بشیراں زچگی سے فارغ ہوئی تو ننھے کو ساس کی گود میں ڈال کر اس نے آہستہ آہستہ ڈوئی پر قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ کچھ دبی دبی زبان میں اس نے ساس پر حکم چلانا بھی شروع کر دیا۔

"ماسی! ذرا تندور تو تپا لے۔ میں ننھے کو دودھ پلا لوں۔"

"ماسی! ذرا ہانڈی تو دیکھ لے کہیں مسالہ لگ نہ جائے۔"

"یہ تھوڑے سے کپڑے ہیں۔ اگر ٹیوب ویل پر جا کر دھو لائے تو تیرے پیچھے میں گھر کے سارے کام کاج نبیڑ لوں۔"

اور جب جیناں تندور پر روٹیاں پکا کر چنگیر بھر کے لاتی تو بشیراں ہانڈی سامنے رکھے پیڑھی پر براجمان نظر آتی۔ روٹیاں چپڑتی' ہنڈیا سے سالن نکال کر رکابیوں میں ڈالتی' کامے کے ہاتھ چھاہ ویلا اور بھتے ویلا ٹیوب ویل پر بھیج کر بچوں کو کھانا کھلاتی۔ سب سے آخر میں ماسی کی باری آتی۔ رات کا کھانا بشیر گھر آکر کھاتا تھا اور بشیراں بڑی تمکنت سے پیڑھی پر اس کے لئے کھانا پروستی۔ وہ پُوچھتا "بے بے کو روٹی دی؟"

"سب کچھ بے بے کا ہے' جب چاہے گی' کھالے گی۔"

اور بے بے کو سب سے آخر میں کھانا ملتا۔ کبھی کبھار یہ ہوتا کہ روٹی کم پڑ جاتی اور بشیراں جو ڈوئی پر قابض ہو چکی تھی لیکن ڈوئی کی اس ریت سے آگاہ نہ ہو سکی تھی کہ اس کے لئے کچھ قربانی بھی دینا پڑتی ہے' بچوں کی روٹیوں میں سے بچے ہوئے ٹکڑے خود کھانے کی بجائے ساس کو کھانے کے لئے دیتی۔

جیناں کو اب بچے کھُچے ٹکڑے کھا کر ذلت کا احساس ہوتا۔ یوں لگتا کہ جس گھر میں وہ رہ رہی ہے' اب اس کے لئے پرایا سا ہو گیا ہے۔ یہ گھر مہردین کو ورثے میں ملا تھا لیکن دونوں نے مل کر اس کے کچے کمروں کو پکے کمروں میں تبدیل کیا تھا۔ وہ گھر کو چمکاتی لشکارتی رہتی تھی اور اب اس کے حصے میں جو کوٹھری آئی تھی' وہ اسے قید خانہ معلوم ہونے لگی تھی۔ وہ زیادہ وقت ٹیوب ویل پر گزارتی۔ اسے اپنی جھوٹی سے بہت پیار تھا۔ وہ ابھی کٹیا ہی تھی کہ جیناں نے اس کی دیکھ بھال شروع کر دی تھی کیونکہ یہ پنج کلیان تھی اور پنج کلیانیں بڑی بھاگوان ہوتی ہیں۔

ایک دن بشیراں نے اسے بہت جھڑکا کہ وہ گھر کے کام کاج سے بچنے کے لئے ٹیوب ویل پر چلی جاتی ہے۔ ایک فقرہ اس کا بہت ہی کٹیلا تھا کہ ماسی تو اپنی عمر تو دیکھ' ماسٹر (مہردین) سے ملنے کا اتنا ہی شوق ہے' تو اپنی کھاٹ اور بستر ٹیوب ویل پر لے جا۔

جیناں اس بات کو پی گئی اور اس نے مہردین سے اس کا تذکرہ نہ کیا۔

----O----

مہر دین کو بھی اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے باوجود زیادہ آرام نہ ملا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ جاٹ جب تک چارپائی سے لگ نہیں جاتا' وہ کھیتی سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اب بشیر اور نذیر دونوں کی کوشش ہوتی کہ بابے سے زیادہ سے زیادہ کام لیتے رہا کریں۔

کبھی بشیر کہتا "بابا! آج میرا کاماں کھاد لینے گیا ہوا ہے اور چارا کاٹنا ہے اور کُترنا بھی ہے۔" مہر دین کو نہ صرف بشیر کے ساتھ مل کر چارا کاٹنا پڑتا بلکہ ٹوکے پر دتھے بھی لگانا پڑتے۔ نذیر بابے کو ذرا فارغ دیکھتا یا ٹیوب ویل بند ہوتا تو کہتا "آلوؤں کے کھیت میں گوڈی ہو رہی ہے اور مٹی چڑھائی جا رہی ہے' جب تک سر پر کھڑا نہ ہوا جائے لاوے کام نہیں کرتے' تو ذرا کھیت میں تو چلا جا' میں بیری والے کھیت میں ٹریکٹر چلوا لوں۔"

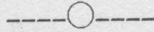
جب ٹیوب ویل کی بجلی کا بل ادا کرنا ہوتا تو بشیر اور نذیر دونوں لیت و لعل کرتے۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی بہانہ ہوتا۔ مہر دین کے پاس جو جمع پونجی تھی' وہ بڑی جلدی سے خرچ ہونے لگی اور ایک دن اس نے دیکھا کہ بجلی کا بل ادا کر کے اس کا کیسہ خالی ہو گیا ہے۔ اگلی بار اس نے بشیر اور نذیر سے پیسے مانگے تو بشیر نے کہا "بابا! میرا خیال ہے بے بے کے پاس تھوڑی بہت رقم ضرور ہو گی' فصل اٹھنے تک بے بے سے ادھار لیتے رہو' تب ہم ایک ایک پیسہ ادا کر دیں گے۔"

جب جیناں ٹیوب ویل پر آئی تو مہر دین نے بشیر اور نذیر کو بلا لیا اور ان کی موجودگی میں اس سے بات کی تو وہ اچانک غصے میں آ گئی۔ اس نے کہا "بشیرے! دو سال سے تو الگ ہے' بتا تُو نے مجھے کتنے پیسے دیئے؟"

پھر اس نے مہر دین سے مخاطب ہو کر کہا "چودھری! تیرا بیٹا نذیر تیری بڑی خدمت کرتا ہے' اس نے تو تجھے بڑی رقم دی ہو گی؟" بشیر اور نذیر دونوں شرمندہ ہو گئے۔

اب وہ مشترکہ طور پر بل ادا کرنے لگے تو ان کے رویے بہت سخت ہو گئے۔ بشیراں اور نذیراں دونوں نے کنجوسی شروع کر دی اور بابے اور بے بے کی حد تک کچھ زیادہ ہی۔ بشیراں نے اپنی ساس کو ڈوئی کی خوب مار دی۔ اسے سیر ہو کر بچے کھچے ٹکڑے بھی کھانے کو نہ ملتے۔ نذیراں روٹی چپڑتی ضرور لیکن دکھاوے کی حد تک۔ روٹی نرم نہ ہوتی اور بابے کو لقمے چبانے اور نگلنے میں دقت ہوتی۔ دونوں بھائیوں کی لیریاں تقریباً ایک ہی وقت میں سوکھ گئی تھیں اور مانگے تانگے کی پتلی کنجالسی سے بابے کا لقمہ تر نہ ہوتا۔

اس اثنا میں جیناں کی "جھوٹی" بیاہی گئی تھی اور جب تک وہ بچہ نہ جنی، جیناں چپ چاپ ڈوئی کی مار کھاتی رہی۔ بشیراں اور نذیراں دونوں خوش تھیں کہ اب لسی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔



پھر ایک دن مہردین نے دیکھا کہ جیناں ٹیوب ویل پر آکر مٹی گوندھنے لگی ہے۔ اس میں بھوسا ملا کر اس نے گارا بنایا اور ٹیوب ویل والی کوٹھڑی کو لیپنا پوتنا شروع کر دیا۔ دو تین دن بعد جب لیپائی سوکھی تو اس نے دیکھا کہ جیناں سر پر ایک بڑا سا گٹھڑ رکھے گاؤں کی طرف سے چلی آ رہی ہے۔ مہردین کے سامنے اس نے گٹھڑ کھولا تو اس میں سے اس کے جہیز کے پرانی طرز کے بچے کھچے برتن نکلے۔ تب مہردین سمجھ گیا اور مسکرا کر خاموش ہو رہا۔ جیناں نے برتن دھو مانجھ کر چمکا دئے۔

اس سے اگلے دن کمہاری ایک چاٹی، ایک کنالی اور ایک ہانڈی ٹیوب ویل پر لے آئی۔ گاؤں کا ترکھان ایک چوکی، ایک مداہنی اور ایک پڑچھتی بنا کر لے آیا جو اس نے کوٹھڑی کی دیوار میں لگا دی۔ جیناں نے چمکائے ہوئے برتن اس پر سجا دئے۔ پھر اس نے کوٹھڑی کے باہر چولھا چوکا بنایا۔ اب پہلن جھوٹی کا دودھ بوہلی اور بوہلے کی منزل سے گزر چکا تھا۔ تب ایک شام وہ اپنا بستر بھی ٹیوب ویل پر لے آئی۔ پہلن کا

دودھ دوھ کر اس نے گرم کیا اور جب ٹھنڈا ہوا تو اسے کھٹا لگا دیا۔

صبح سویرے جب چاٹی میں گھمک گھوں مداہنی چلی تو مہردین جاٹ کو وہ زمانہ یاد آ گیا جب مداہنی کے ساتھ ڈوئی بھی جیناں کے ہاتھ میں آئی تھی اور اب تو مدت سے اس نے مداہنی کا نغمہ نہ سنا تھا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کر رہا ہو۔ جیناں نے لسی پر سے مکھن اکٹھا کیا جو اتنا کم تھا کہ پیالی بھی نہ بھری گئی۔ پھر اس نے چولھا جلایا اور تازہ مکھن سے دو پراٹھے پکائے اور آواز دی ''چودھری آ! چھاہ ویلا کھا لے۔''

اور مہردین کے گلے میں نرم اور تر پراٹھے کے لقمے پھنسنے لگے کہ ابھی بشیر اور نذیر کا چھاہ ویلا گاؤں سے نہیں آیا تھا اور جیناں کا جی بھی کُڑھ رہا تھا۔ مہردین جی کڑا کر کے لسّی کے ساتھ پراٹھا کھاتا رہا لیکن جیناں سے نہ رہا گیا۔ وہ پڑچھتّی سے پیتل کے لشکتے ہوئے دو چھنّے اُتار لائی۔ بشیر اور نذیر ٹیوب ویل سے کچھ دُور اپنے اپنے کھیت میں کام کر رہے تھے۔ وہ ان کی طرف منہ کر کے پکاری ''وے بشیر! وے نذیر! اِدھر آ کر لسّی پی لو۔''

تب پیڑھی پر بیٹھ کر دونوں چھنّے لسی سے بھرے اور جب تک دونوں بھائی نہ آئے، وہ چھنّوں کو دیکھتی رہی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہے!

یہ خوشی کے آنسو تھے یا غم کے؟ کون جانے؟

میرا خیال ہے، یہ ممتا کے آنسو تھے۔ اور ممتا کے آنسوؤں میں جو اسرار ہے، اُس پر سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے؟

(جولائی ۱۹۹۹ء)

☆ ☆ ☆

ترقی کا "میراج"

وہ چھوٹے چھوٹے کسانوں کا ایک گاؤں تھا' جہاں ووٹ بہت تھے' چنانچہ ہر الیکشن پر اس کی اہمیت بڑھ جاتی تھی۔ ایک الیکشن سے پہلے اس علاقے کا ایم پی اے جو اس الیکشن میں پھر انتخاب لڑنا چاہتا تھا' گاؤں میں آیا تو نمبردار کی حویلی میں اس کی گاؤں کے عوام سے ملاقات کرائی گئی۔ ایک مسخرے نے کہا "ممبر صاحب! پچھلے تین سالوں میں اس گاؤں میں صرف تین اموات ہوئیں' کیا اُن کی آپ فاتحہ پڑھنا چاہتے ہیں؟" ممبر نے طنز محسوس تو کی لیکن فاتحے کے لئے ہاتھ اُٹھا دئے۔ اس کے بعد وہی مسخرا بولا "ممبر صاحب! اُن وعدوں کی وفات پر بھی فاتحہ پڑھ لیجئے جو پچھلے الیکشن پر آپ نے کئے تھے۔" ممبر نے محسوس کیا کہ اس گاؤں کی عوام اب خاصی ہوشیار ہو گئی ہے تو اس نے اپنی وعدہ خلافیوں پر ندامت کا اظہار کیا اور ان کے ازالے کا وعدہ کیا۔ گاؤں کے نمبردار نے کہا "فی الحال آپ اتنا کیجئے کہ ہمارے گاؤں میں پرائمری سکول کھلوا دیجئے۔"

اس نے کہا "زمین حاصل کرنے اور عمارت تعمیر کرنے میں دیر تو لگے گی۔"

"اشتمال میں ہم نے چار کنال شاملات سکول کے نام کروا لی تھی۔ دو کمرے بھی تعمیر کر لئے ہیں۔ بس آپ کوئی منشی بھیج دیجئے اور ہمارے گاؤں کے منشی محمد حسین کا تبادلہ یہاں کروا دیجئے گا۔" نمبردار نے کہا۔

منشی محمد حسین پی ٹی سی کا تخلص بیدار ہے لیکن پی ٹی سی کرنے کے دوران ان کے ایک استاد نے ان کا تخلص بیدار سے خفتہ میں بدل دیا تھا کیونکہ وہ اکثر پڑھاتے

پڑھاتے سو جایا کرتے تھے۔ اب ان کے رفقائے کار انہیں خُفتہ ہی کہتے تھے کہ سوال لکھا کر وہ اکثر کُرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھ جاتے تھے۔ جب جاگتے تو پوچھتے "اوئے! کم بختو! آسان سا سوال نکالنے میں بھی اتنی دیر لگا دی؟"

منشی محمد حسین جب اپنے گاؤں میں اول مدرس لگ کر آئے تو وہ "خُفتہ" سے "بیدار" ہو چکے تھے۔ شروع شروع میں اول بھی وہی تھے اور آخر بھی وہی۔ پہلی جماعت میں داخلے کے لئے انہوں نے "عمر" کا معیار یہ رکھا تھا کہ طالب علم کو ابھی داڑھی مونچھ نہ آئی ہو۔ پہلی بار جو سکول کھلے' اسے محکمہ ٹاٹ' تختہ ہائے سیاہ' ایک دو میز کرسیاں اور دو چار چاک کے ڈبے ضرور مہیا کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ بھول جاتا ہے کہ ٹاٹ خستہ بھی ہو جاتے ہیں اور چاک ختم بھی ہو سکتے ہیں۔

منشی محمد حسین بیدار نے سکول کی چار کنال زمین کے گرد سنتھے کی باڑ لگوائی۔ کچھ درخت بھی لگائے۔ کوڑی کوڑی جوڑ کر نلکا بھی لگوایا۔ سکول کے صحن میں گھاس بھی لگوائی اور پہلی جماعت کے ساتھ بہت محنت کی۔ اے۔ ای۔ او صاحب معائنے پر آئے تو بہت خوش ہوئے۔ منشی محمد حسین بیدار کی سند پر "وری گڈ" کا ریمارکس لکھا۔ یوں منشی صاحب نے بھی ان کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مرغ کا قورمہ پکوایا اور اپنے علاقے کی خوشبو دار باستمی کے چاول کو پیاز کا بگھار دے کر غریبانہ سا پلاؤ بھی بنوایا اور کہا "صاحب! اگلے سال دوسری جماعت شروع ہو رہی ہے' کچھ ٹاٹ چاہئیں اور ایک تختۂ سیاہ بھی۔ چاک کا ڈبا تو ہمیں کبھی ملتا ہی نہیں۔ ایک استاد بھی اور ملنا چاہئے۔" ان سب ضروریات میں سے انہیں صرف چاک کا ایک ڈبا ملا۔ اگلے سال انہوں نے دو جماعتیں تیار کیں اور پھر وری گڈ کا ریمارکس حاصل کیا۔ اب گزشتہ چھ سالوں سے ان کا سکول خاصا آباد ہو چکا تھا۔ سکول میں پانچ استاد تھے اور پانچ ہی جماعتیں تھیں۔ صرف ایک کمرے کا اضافہ ہوا تھا لیکن صحن میں جو بکائن کے درخت انہوں نے لگوائے تھے' ان کا سایہ اتنا ہو چکا تھا کہ دو جماعتیں گرمیوں میں وہاں

بیٹھ سکتی تھیں۔ سردیوں میں دھوپ وافر ہوتی تھی۔

گزشتہ چار سالوں سے سرکار نے سکول کو ٹاٹ سپلائی کئے تھے' نہ کوئی نیا فرنیچر۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ سرکار ان کے لئے فنڈ تو مہیا کرتی ہے لیکن ٹاٹ اور فرنیچر کاغذ کے بلوں اور ووچروں سے نکل کر سکول کے فرش پر آکر نہیں بچھتے تھے' لوگ کہتے افسرانِ بالا کھا گئے۔ منشی محمد حسین بیدار کہتے "ٹاٹ اور فرنیچر کھانے کی چیزیں تو نہیں کہ افسرانِ بالا کھا جائیں۔ ایسی افواہیں شرپسند اڑاتے ہیں۔"

منشی محمد حسین بیدار نے اس کا حل یہ سوچا کہ ہر طالب علم بوری کا ایک ٹکڑا ساتھ لائے اور ایک چوکی گاؤں کے بڑھئی سے بنوائے۔ اس کا سائز اور ڈیزائین انہوں نے خود تجویز کیا تھا تاکہ ایک ہی قسم کی چوکیاں ہوں اور زیادہ جگہ نہ گھیریں۔ ہر جماعت کے دو لڑکوں کی باری باری ڈیوٹی لگتی تھی کہ وہ صبح کی دعا سے پہلے آکر اپنے اپنے کمرے کی صفائی کریں۔ صبح کی دعا کے بعد لڑکے اپنی اپنی جگہ پر بوریوں کے پارچات بچھا لیتے اور آگے اپنی اپنی چوکی رکھ لیتے۔ اس سے سکول کی فضا میں ایک تنظیم نظر آتی۔ ایسے ہی باہر درختوں کے نیچے بھی ترتیب و تنظیم کا یہی منظر دکھائی دیتا۔ لوگ کہتے کہ ہر ماسٹر اگر محمد حسین بیدار کی تقلید کرے تو سرکار کی عدم توجہی کے باوجود سکول خوش اسلوبی سے چلتے رہیں اور درس و تدریس کی فضا میں بیداری زیادہ اور خفتگی کم نظر آئے۔

کبھی پرائمری سکول کے طلبا کے پاس دو تین کتابیں ہوتی تھیں' ایک سلیٹ اور ایک تختی۔ مائیں انہیں موٹے کپڑے کے بستے سی دیا کرتی تھیں۔ اب کتابیں بڑھ گئی تھیں اور کاپی پنسل کا رواج ہو گیا تھا۔ بستوں کا حجم بڑھ گیا تھا۔ تختی اور سلیٹ متروک ہو چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچے بستے کے بوجھ سے کراہنے لگے تھے اور والدین کاپی پنسل کے خرچ سے گراں بار ہو کر ہانپنے لگے۔

منشی محمد حسین بیدار نے اپنے سکول میں کاپی اور پنسل کو زیادہ دخیل اور تختی

اور سلیٹ کو سکول بدر نہ ہونے دیا۔ اس کے ماتحت اساتذہ کہا کرتے تھے۔ "منشی محمد حسین تو پتھر دھات کے زمانے کے آدمی ہیں۔" دوسرے استاد اپنے آپ کو منشی نہیں، ماسٹر کہلوانا چاہتے تھے۔ منشی محمد حسین اس کی اجازت بھی نہیں دیتے تھے۔ ان کے نزدیک دیسی سکولوں میں منشی ہوتے ہیں اور ولایتی سکولوں میں ماسٹر۔ یوں دیکھا جائے تو دونوں کچھ بھی نہیں ہوتے، نہ منشی، نہ ماسٹر۔

پھر کرنا خدا کا یوں ہوا کہ اتفاق سے ایک بیدار مغز اور تجربہ کار سیاست دان صوبے کا چیف منسٹر ہو گیا جس کا تعلیمی پس منظر دیہاتی تھا اور اسے کسی بڑے کالج میں داخل ہونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اور اتفاق ہی سے اسے اپنا وزیر تعلیم ایک گھاگ سٹوڈنٹ لیڈر مل گیا جس نے سالوں تک ایک کالج کے ہوسٹل پر قبضہ کر رکھا تھا اور تیس بتیس سال کی عمر میں ایم۔ اے بھی کر لیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اپنی جگہ کسی اور شخص کو امتحانی سٹول پر بٹھا دیا تھا۔ وہ چیف منسٹر سے بھی زیادہ بیدار مغز نکلا، اور تجربہ کار بھی۔ اس نے اسمبلی میں تقریر کی "ہم بہت جلد ایک ایسی تعلیمی پالیسی نافذ کرنے والے ہیں کہ جس سے پرائمری تک تعلیم مفت اور لازمی ہو جائے گی، کتابیں اور کاپیاں بچوں کو مفت ملا کریں گی۔ یہی نہیں، ہم امیروں اور غریبوں کے سکولوں میں تفاوت یک قلم ختم کر دیں گے انگریزی کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے نافذ کریں گے اور ٹاٹ کی جگہ پرائمری سکولوں میں ڈیسک اور کرسی والا تعلیمی کلچر نافذ ہو گا۔" اس پر بہت سی تالیاں بجیں اور ڈیسک پیٹے گئے۔ ایک ممبر نے پوائنٹ آف آرڈر پر اٹھ کر کہا "کیا معزز وزیر صاحب بتائیں گے کہ صرف ڈیسک اور کرسی والا کلچر نافذ کرنے سے امیر غریب کی تفریق مٹ جائے گی؟" وزیر تعلیم صاحب آئیں بائیں شائیں کرنے لگے تو ایک اور ممبر نے اٹھ کر کہا "امیر غریب کی تفریق صرف اسی صورت میں مٹ سکتی ہے کہ امیروں کے پرائمری سکولوں میں انگریزی کی جگہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے اور کرسی ڈیسک کی جگہ ٹاٹ کا کلچر نافذ کیا جائے۔" اس پر بھی بہت سی تالیاں

بجیں اور ڈیسک پیٹے گئے۔

وزیر تعلیم صاحب بہت چیں بر جبیں ہوئے۔ ان کی جگہ ایک ممبر نے جواب دیا "وزیر تعلیم صاحب کا اپنا صاحبزادہ ایک پوش انگریزی سکول میں پڑھتا ہے۔ اگر وہ اپنی پالیسی سے مخلص ہیں تو اپنے بچے کو اپنے گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل کر دیں کہ جہاں کُرسی ڈیسک کا کلچر نافذ ہونے والا ہے۔" اس پر اتنے زور سے ڈیسک پیٹے گئے کہ ایک ڈیسک کے ٹُوٹنے کی آواز بھی آئی۔

اور ایک دن یہ پالیسی صوبے میں نافذ ہو گئی۔ خوش قسمت دیہات کی فہرست میں اس گاؤں کا نام بھی آ گیا۔ سکول کی عمارت میں اضافہ کیا گیا نہ مرمّت کرائی گئی البتہ ڈیسک اور کرسیاں بن کر آ گئیں۔ اساتذہ کو بھی کُرسی میز ملے اور بلیک بورڈ بھی نئے بن کر آئے۔ والدین کو صرف یہ تکلیف دی گئی کہ وہ بچوں کو نئی یونیفارم سلوا دیں اور اساتذہ سے کہا گیا کہ وہ بھی ڈھنگ کے کپڑے پہن کر سکول آیا کریں۔ اگر انہیں ایک ایک بُش شرٹ اور پتلون سرکاری طور پر مل جاتی تو بہتر ہوتا کیونکہ انگریزی پڑھانے کے لئے جو بابو نما بی۔اے بی ایڈ ٹیچر سکول میں لگے تھے' وہ بُش شرٹ اور پینٹ پہنتے تھے۔ فی الحال اول مدرسی منشی محمد حسین بیدار کے نام محفوظ تھی۔

اور اس سال یکم اپریل کو صحن میں جو مارننگ اسمبلی ہوئی' اس میں پہلے اور دوسری کے طالب علم شریک نہ ہوئے' انہیں چھٹی کر دی گئی کہ ان کے بیٹھنے کے لئے کمرے نہیں تھے (ان کے حصے کے کُرسی ڈیسک بھی سرکار نے مہیا نہیں کئے تھے۔) اور یہ اس سکول کی یادگار اسمبلی تھی کہ اس میں صوبائی وزیر تعلیم' علاقے کے ایم پی اے اور ایم این اے صاحبان' یونین کونسل کا چیئرمین' عام کونسلر اور محکمہ تعلیم کے افسر شریک ہوئے۔ ٹیلی وژن کے لوگ بھی آئے اور اخباروں کے رپورٹر بھی۔ گاؤں کے لوگ بھی جمع تھے' غرضیکہ میلے کا سا سماں تھا۔

"لب پہ آتی ہے دعا۔" حسب معمول کچھ زیادہ سُر تال میں نہ تھی لیکن پُر اثر

ضرور تھی کہ وزیر تعلیم کے چہرے پر سرشاری کی کیفیت تھی کہ وہ ملک و قوم کے لئے ایک عظیم کارنامہ سرانجام دے رہے تھے۔

صوبائی وزیرِ تعلیم نے اپنے دستِ مبارک سے لڑکوں کو کتابوں' کاپیوں اور پنسلوں والا ایک ایک بستہ عطا فرمایا اور اس دوران کیمرے کھٹ کھٹ کرتے رہے۔ اس کے بعد لڑکے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے اور ڈرتے ڈرتے کُرسی ڈیسک پر جا بیٹھے۔ وزیر صاحب نے معززین کے ہمراہ تینوں کمروں کا دورہ کیا۔ مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی اساتذہ بلیک بورڈوں پر پل پڑے۔ اس سے قبل بلیک بورڈ کے استعمال کا اتنا شوق کبھی ان کے دل میں پیدا نہ ہوا تھا۔ کیوں نہ ہوتا؟ آج سے ایک نئے دَور کا آغاز ہو رہا تھا۔

ماسٹر محمد حسین بیدار جو پانچویں جماعت کے استاد تھے' انہوں نے نئے چاک کے ٹکڑے سے نئے بلیک بورڈ پر ایک محاورہ لکھا "ترقّی کا میراج" اور لڑکوں سے کہا اسے استعمال کریں۔ لڑکے حیران رہ گئے۔ ایک لڑکے نے جرات سے کام لیتے ہوئے کہا "منشی جی! کتاب میں تو "ترقی کی معراج" لکھا ہوا ہے۔"

"پہلے تو یہ بات ذہن نشین کر لو کہ آج سے اپنے استاد کو "منشی جی' نہیں "سر" کہہ کر مخاطب کیا کرو اور دوسری بات یہ ہے کہ کیا تم نے پچھلے یوم پاکستان پر میراج طیارے اُڑتے ہوئے نہیں دیکھے تھے؟" منشی محمد حسین بیدار نے پوچھا۔

"دیکھے تھے سر!" سب لڑکے یک زبان ہو کر بولے کیونکہ گاؤں میں دو چار ٹیلی وژن سیٹ بھی تھے۔

تب منشی محمد حسین بیدار کُرسی پر بیٹھ گئے اور بیٹھے بیٹھے اونگھ گئے۔ لڑکے اور بھی حیران ہوئے۔ جب اونگھ سے بیدار ہوئے تو انہوں نے سکول میں چھُٹی کر دی!

اس رات گاؤں کے جس گھر میں اور گاؤں کی واحد دکان پر جہاں جہاں ٹیلی وژن سیٹ تھا' لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ خبرنامے میں پہلے مارننگ اسمبلی کی حمد سنائی اور

دکھائی گئی۔ عجیب بات تھی کہ آوازیں بہت سریلی ہو گئی تھیں۔ اصل میں تصویر میں لڑکوں کے منہ ہلتے تھے لیکن پیچھے ریکارڈ لگا ہوا تھا اور جب وزیرِ محترم نے پہلا بستہ پہلے لڑکے کے ہاتھ میں تھمایا تو یہ مصرع کہلوایا جا رہا تھا۔

ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا

شاید ایک یا ڈیڑھ منٹ کی خبر تھی لیکن گاؤں کی تاریخ میں یادگار بن گئی!



گاؤں کی اس عزت افزائی کا منشی محمد حسین بیدار پر نجانے کیوں الٹا اثر ہوا۔ اب وہ سوال لکھا کر کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھ جایا کرتے تھے۔ اساتذہ پر ان کا رعب داب بھی کچھ کم ہو گیا۔ پانچ اساتذہ میں سے دو تین استاد اکثر مارننگ اسمبلی میں بھی نہ پہنچ سکتے۔ خاص طور پر بُش شرٹ پینٹ والے بی۔اے۔ بی ایڈ ماسٹر صاحب تو مارننگ اسمبلی میں شرکت کو اپنی توہین سمجھتے تھے۔ یوں بھی وہ انگریزی کی وجہ سے پی ٹی سی ماسٹروں سے ایک فاصلہ قائم رکھتے تھے۔ ماسٹر محمد حسین خفتہ کو دل سے وہ اپنا اول مدرس بھی نہ مانتے تھے۔ اگر ماسٹر محمد حسین بیداری کی حالت میں ہوتے تو یقیناً انہیں جلد ہی راہ راست پر لے آتے۔

ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ بستوں کے سٹریپ ٹوٹ گئے اور لڑکے منج کی رسیاں باندھ کر کام چلانے لگے۔ کرسیاں اور ڈیسک شکستہ ہو گئے کہ لکڑی میں حسن نیت کا گھن لگا ہوا تھا اور اس پر حب الوطنی کا روغن چڑھا ہوا تھا۔ غریب والدین بچوں کو کاپیاں اور پنسلیں مہیا کرنے سے عاجز آ گئے البتہ گاؤں کا واحد دکاندار بہت خوش تھا کہ اس کی آمدنی خاصی بڑھ گئی تھی۔

ابھی اگلا الیکشن دور تھا۔ تاہم گاؤں کے لوگوں نے اپنے نمبردار کو ایم پی اے کے پاس یہ درخواست لے کر بھیجا کہ کرسیاں اور ڈیسک ٹوٹ گئے ہیں اور اس بری طرح سے ٹوٹے ہیں کہ ان کی مرمت بھی نہیں ہو سکتی۔ لڑکوں کے بستوں کا بھی برا

حال ہے اور منج کی رسیاں بھی کام نہیں دے رہیں۔ ہم غریب والدین بچوں کو اب کاپیاں اور پنسلیں مہیا نہیں کر سکتے۔ براہ کرم سکول کو نیا فرنیچر' نئے بستے اور کاپیاں پنسلیں مہیا کی جائیں۔ ایم پی اے نے اسمبلی میں سوال اٹھایا تو وزیراعلیٰ نے جواب دیا "اگلے سال کی قسط پائپ لائن میں ہے۔" جب ایم پی اے نے وزیراعلیٰ کا یہ جواب گاؤں کے نمبردار تک پہنچایا' تو انہیں "پائپ لائن" کے معنی نہیں آتے تھے اور سکول کا بی۔ اے۔ بی ایڈ ماسٹر بھی اس کی وضاحت نہ کر سکا۔

لوگوں نے محکمہ ء تعلیم میں درخواست دی کہ اگر ہمارے بچے اس قابل نہیں کہ کرسی ڈیسک پر بیٹھ سکیں تو انہیں ٹاٹ ہی مرحمت فرمادیے جائیں لیکن سرکار ترقی ء معکوس کی قائل نہیں تھی۔ وہ کرسی ڈیسک کلچر تبدیل کرنے پر تیار نہیں تھی۔ چنانچہ ایک دن ماسٹر محمد حسین خفتہ اچانک بیدار ہو گئے۔ انہوں نے کاٹھ کباڑ کمروں کے کونوں میں لگا دیا اور فرش پر بوریوں کے ٹکڑے پھر سے بچھ گئے اور سلیٹ اور تختی کا استعمال پھر سے جائز قراد دے دیا۔

چنانچہ اگلے سال یکم اپریل کو جو مارننگ اسمبلی منعقد ہوئی' اس میں انگریزی والے ماسٹر سمیت سب اساتذہ حاضر تھے۔ ماسٹر محمد حسین بیدار نے تختہ سیاہ پر ایک محاورہ لکھا "ترقی کی معراج" اور پانچویں جماعت کے لڑکوں سے کہا کہ اسے اپنے جملے میں استعمال کریں۔ ایک لڑکا جو پانچویں جماعت کے محکمانہ امتحان میں پاس نہ ہو سکا' بے اختیار بول اٹھا "سر! پچھلے سال تو آپ نے "ترقی کا میراج" استعمال کروایا تھا۔"

"اس سال تم کرسی اور ڈیسک پر بیٹھے ہوئے تھے۔" منشی محمد حسین بیدار بولے "گویا تم ترقی کے "میراج" پر اڑ رہے تھے۔ آج تم پھر بوری کے ٹکڑوں پر بیٹھے ہوئے ہو' اس لئے میں نے "میراج" کو اپنے اصلی معنوں "معراج" میں بدل دیا ہے۔ مزید برآں یاد رکھو! آج سے میں "سر" نہیں' "منشی جی" ہوں!"

(اکتوبر ۱۹۹۹ء)

☆ ☆ ☆ ☆

چاچا بُوٹا موٹر وے پر

موٹر وے چاچا بوٗٹا کے گاؤں نور پور سے صرف ایک فرلانگ کے فاصلے پر ہے!
موٹر وے نے اس کے گاؤں کی زمین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو گاؤں کے دونوں حصوں کے درمیان صرف ایک جنگلے سے دوسرے جنگلے تک کا فاصلہ ہے لیکن یہ فاصلہ طے کرنے کے لئے نور پوریوں کو کم از کم دو میل کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ ایک انڈر وے میں سے گزر کر دوسری طرف پہنچنے کے لئے جنگلے کے متوازی ایک میل اِس طرف اور ایک میل اُس طرف چلنا پڑتا ہے' چنانچہ کچھ لوگ آہستہ آہستہ جنگلے کے اس پار جا آباد ہوئے۔ چاچا بوَٹے کے پاس دس ایکٹر زمین ہے جو دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ اس کے دو ہی بیٹے ہیں۔ بڑے بیٹے کو اس نے موٹر وے سے پار بھیج دیا ہے' وہاں اس نے ایک کُٹیا اُسار لی ہے۔ اصل میں دو تین سالوں سے اس کی بڑی بہو چاہ رہی تھی کہ اپنا الگ گھر بسائے۔ یہ عورتوں کی فطرت ہے کہ وہ اپنے گھر پر بلاشرکت غیرے حکومت کرنا چاہتی ہیں یعنی ساس کے گھنے سایہ ء عاطفت کے نیچے سے اٹھ کر چلچلاتی دھوپ مین بھی ڈیرا لگانے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ اُدھر کے نور پور میں ابھی تک درخت بھی بہت کم ہیں چنانچہ بڑی بہو کے صحن میں دھریک کے جو بوٹے لگائے گئے ہیں' ابھی ان میں سایہ نہیں دھوپ ہی دھوپ ہے اگرچہ سردیوں میں دھوپ بھلی لگتی ہے لیکن گرمیوں میں دھوپ کٹیا کے اندر بھی گھس آتی ہے اور اس سے پناہ نہیں ملتی۔ اگلے سال دھریک کا سایہ ہو گیا ہے۔ اب اصل نور پور کو نور پور کلاں کہتے ہیں اور ذیلی نور پور کو نور پور خورد۔

چاچا بُوٹا جنگلے کے اِس پار کھڑا ہو جاتا ہے اور اُس کا بیٹا جنگلے کے اُس پار۔ دونوں نے اشاروں کی زبان ایجاد کر لی ہے۔ اشاروں ہی اشاروں میں ایک دوسرے کی خیر خیریت دریافت کر لیتے ہیں۔ کاریں، بسیں اور ٹرک گزرتے رہتے ہیں اور اس رواں دواں پس منظر میں باپ بیٹوں کے درمیان لاسلکی ملاقات بھی جاری رہتی ہے۔

چاچا بوُٹے کو موٹروے سے بہت محبت ہے کہ اس نے اس پر کسی بیلچہ چلایا ہے۔ جس جگہ پسینہ بہے، اس سے پیار تو ہو جاتا ہے۔ موٹروے کو بنتے بنتے پانچ چھ سال لگ گئے۔ جب بن رہی تھی تو وہ اس کے اوپر سے گزر جایا کرتے تھے، ہَل اور بیل لے کر اور دوسری طرف کی زمین میں "واہی بیجی" کر لیتے تھے۔ جب دونوں طرف جنگلے لگے تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اب موٹروے اس کی نہیں رہی۔ اس پر کاریں، بسیں اور ٹرک چل سکتے ہیں لیکن پیدل آدمی اس پر قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔

چاچا بوَٹے کی سوچ بہت مثبت ہے۔ وہ پرانی نسل کا آدمی ہے۔ اس کی فطرت میں بغاوت کا عنصر بہت کم ہے ورنہ وہ سوچ سکتا تھا کہ جس سڑک کی مٹی میں میرا خون پسینہ شامل ہے، کیا میں وہاں اپنا قدم بھی نہیں ٹکا سکتا؟ وہ سوچتا ہے کہ آئے دن پاکستان میں امیروں کے محل تعمیر ہو رہے ہیں اور غریبوں کی کُٹیائیں بھی اُساری جا رہی ہے۔ محل اور کٹیا کی تعمیر کے بعد کوئی ایسا راج مزدور ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ اس میں شریک ہے۔ نہیں! محل اور کُٹیا دونوں میں ان کے مالک ہی رہیں گے۔ راج مزدور ایک مکان مکمل کر کے دوسرے مکان کی تکمیل میں مصروف ہو جائیں گے لیکن سڑک کی بات کچھ اور ہے۔ اس پر سے کاریں، چھکڑے، تانگے، ریڑے سبھی گزرتے ہیں اور پیدل آدمی بھی اس پر چل سکتا ہے، لیکن موٹروے پر چلنے کی اجازت نہیں۔ کار یا بس پر سوار ہو کر اس کی سیر کی جا سکتی ہے جیسے اب تھوڑے سے ٹکٹ کے پیسے دے کر شاہی قلعے کے ان محلوں اور راہداریوں کی سیر کی جا سکتی ہے جہاں کبھی شہنشاہ، ملکائیں اور شاہزادیاں رہتی تھیں اور کسی چاچا بُوٹے کو وہاں پَر مارنے کی اجازت بھی

نہیں تھی۔ چاچا بُوٹا ایک بار شاہی قلعے کی سیر کر چکا ہے اور دیوان عام کی شہ نشین پر بیٹھ کر اسے یوں لگا جیسے وہ مغل شہنشاہ شاہ جہاں کا کوئی مصاحب خاص ہو!

موٹروے پر سفر کرنے سے اسے کون روک سکتا ہے؟ لیکن مشکل یہ ہے کہ پہلے شیخوپورہ جانا پڑتا ہے' پھر وہاں سے اس ویگن پر سوار ہونا پڑتا ہے جو کم از کم پنڈی بھٹیاں جاتی ہو۔ لیکن تاحال پنڈی بھٹیاں تک جانے کے لئے کوئی ویگن اتنا موڑ کیوں کاٹے اور موٹروے کا ٹیکس ادا کرے۔ وہ سرگودھا روڈ سے سیدھی پنڈی بھٹیاں پہنچ سکتی ہے۔ کرائے کی بھی بچت اور وقت کی بھی بچت۔

جب تک موٹروے پر مٹی پڑتی رہی اور کسی اور بیلچے کا کام رہا' چاچا بُوٹے کا سابقہ اپنے پاکستانی افسروں سے رہا۔ جیسے بھی تھے' بُرے یا بھلے' اپنے تو تھے۔ وہ ایک دوسرے کی بات تو سمجھتے تھے۔ ایک دوسرے کے دُکھ درد کو تو جانتے تھے حالانکہ اب دل بہت کٹھور ہو چکے ہیں کہ ایک دل کا دکھ دوسرے دل میں مشکل ہی جگہ بنا سکتا ہے۔ اس اثنا میں وہ مزدوروں کی ایک ٹولی گینگ کا میٹ بھی بن گیا تھا۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ سڑک پر مٹی ہموار ہو گئی۔ ہزاروں مزدوروں کو یکایک فارغ کر دیا گیا۔ ان کی جگہ "سونگ" صاحبان آ گئے۔ واضح رہے کہ کوریا سے آنے والے انجینئر اور ٹیکنیشن وغیرہ سبھی چاچا بوٹا کے لئے سونگ صاحبان تھے۔ ان میں سے ایک انجینئر کا نام سونگ صاحب تھا۔ چاچا بوٹے کے اوورسیر نے چاچا کا تعارف اس سے انگریزی میں کرایا تھا۔ بعد میں اس نے چاچا بوٹے کو بتایا کہ میں نے سونگ صاحب سے سفارش کی ہے کہ وہ تمہیں کام پر لگائے رکھیں۔ سونگ صاحبان شکل صورت کے لحاظ سے ایک جیسے ہی تھے۔ پیلا رنگ' موٹی ناک' آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں کہ گوشت بھرے چہرے یا پھُولے پھُولے گالوں میں نقطوں کی مانند نظر آتیں۔ قد بھی ایک جیسے۔ ایک سونگ کو دوسرے سونگ سے پہچاننا بہت مشکل تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ ہر سونگ کا چہرہ داڑھی مونچھ سے عاری تھا۔ چاچا بوٹے والے سونگ کی ناک پر اسے برسات کا زرد مینڈک

بیٹھا ہوا نظر آتا جو پہلی مُوسلادھار بارش ہونے کے بعد کھیت کی مینڈھ پر آ بیٹھتا ہے' نجانے کہاں سے نکل کر۔ اس وجہ سے اس کی پہچان آسان تھی۔ یہ سونگ صاحب تھے بھی کوئی بڑے افسر۔ ان کے گاؤں کے سامنے ایک جگہ انہوں نے بہت سی دیوہیکل مشینیں لا کھڑی کیں۔ کچھ عارضی سے ڈربے بنوائے۔ کسی میں اپنی رہائش رکھی' کسی میں اپنا کچن بنوایا۔ ان کی حفاظت کے لئے جو چوکیدار اس نے رکھے' ان کا ہیڈ چاچا بوَٹے کو لگا دیا۔

شروع شروع میں تو اسے سونگ صاحبان سے یگانگت کا کوئی جذبہ محسوس نہ ہوا۔ اسے یہ کسی اور ہی دُنیا کی مخلوق معلوم ہوئے۔ اپنے کام سے کام۔ دونوں ایک دوسرے کی زبان بھی نہیں سمجھتے تھے۔ اشاروں کنایوں سے کام چلتا۔ پھر آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ وہ بھی اسی کی طرح کے انسان تھے۔ وہ یہاں بہتر روزی کی تلاش میں آئے تھے' تبھی تو کسی بھی سونگ صاحب ہاتھ کا کھُلا نہیں تھا۔ مزدوروں کو تنخواہ بھی پاکستانی شرح سے دیتا' کبھی بخشیش نہ دیتا۔ خوش ہوتا تو زرد زرد دانت نکال دیتا' ہاتھ سے کچھ نہ جھڑتا۔ سنا ہے کہ کبھی یورپی یا امریکی لوگ یہاں کوئی کام کرواتے تو مزدور کو عام مزدوروں سے دگنی تگنی تنخواہ دیتے۔ اس پر ہمارے ہی بڑے لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ اس طرح تو مزدور کا مزاج خراب ہو جائے گا لہٰذا باہر کے سرمایہ دار بھی آہستہ آہستہ اپنی "آنے والی جگہ" پر آ گئے۔ ایک دن اس کے ماتحت ایک چوکیدار نے اسے ایک عجیب بات بتائی کہ سونگ صاحبان کتے کا گوشت بڑے مزے لے کر کھاتے ہیں۔ وہ جس کمرے میں کھانا کھاتے ہیں' اس کے پچھواڑے میں کچھ کھانے پینے کی چیزیں ہڈیاں وغیرہ پھینک دیتے ہیں۔ کتے وہاں جمع ہوتے ہیں اور ایک نہ ایک کتا ان میں سے غائب ہو جاتا ہے۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" چاچا بوَٹے نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا۔

چوکیدار اسے ڈائننگ روم کے پچھواڑے میں لے گیا اور ایک گڑھے کی طرف

سڑک کہ گاڑیاں اس پر تیرتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ اگرچہ اس کے بننے سے دودھ اور شہد کی ندیاں بھی نہیں بہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے اس نے گاؤں کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے گاؤں سے شیخوپورہ جانے والی سڑک تک جانے والی جس چھوٹی سڑک پر سولنگ لگی ہے' وہ پکی ہو جاتی تو دو چار دیہات کو فائدہ ہوتا۔ اس سڑک کی اینٹیں ٹوٹ پھُوٹ چکی ہیں اور جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے ہیں۔ تانگے اور ریہڑے میں بیٹھو تو انجر پنجر ڈھیلا ہو جاتا ہے۔

ایک دِن اس نے جنگلے کے ساتھ لگے لگے دیکھا کہ راولپنڈی کی طرف سے کاروں اور موٹر سائیکلوں کا ایک کارواں آیا اور دم بھر میں گزر گیا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ کوئی بڑا آدمی گزرا ہے۔ بعد میں اخبار سن کر معلوم ہوا کہ اس نے 'ملک کا وزیراعظم تھا جو اپنی کار آپ چلا رہا تھا اور سو کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے۔ اخبار میں لکھا تھا کہ یہ وزیراعظم بہت خوش تھا۔ موٹروے کا سنہری خیال سب سے پہلے اسی کے ذہن میں آیا تھا اور اسی کے زمانے میں اس پر کام شروع ہوا تھا۔ پھر ایک خاتون حکومت آ گئی۔ اس نے کہا "موٹروے ایک سفید ہاتھی ہے۔ اسے چار ہی سڑکوں تک محدود رکھو' میری غریب قوم کے غریب عوام چھ راستوں والی موٹروے کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔" لیکن بعدازاں اس نے چھ راستوں کی اجازت دے دی۔ کہتے ہیں کہ اس کے شوہر نے اسے مشورہ دیا تھا۔ کیوں دیا تھا؟ وہی بہتر جانتا ہے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ سونگ صاحبان نے اسے بھی خوش کر دیا تھا۔ لوگ کہتے ضرور ہیں لیکن ثبوت تو نہیں دے سکتے۔ چاچا بُوٹے کو ان افواہوں سے کوئی غرض نہ تھی۔ پھر یہ ہوا کہ خاتون وزیراعظم کو تخت سے اتار دیا گیا اور موٹروے کا افتتاح اسی وزیراعظم نے کیا جس کی کار اس نے کارواں کی صورت میں دیکھی تھی!

لوگ کہتے ہیں کہ اسے اپنے اس کارنامے پر بہت فخر تھا۔ وہ اکثر لاہور سے پنڈی جاتے اور پنڈی سے لاہور آتے' موٹروے پر سفر کرتا اور کار بھی خود ہی چلاتا۔

اشارہ کیا جو آدھا مٹی سے پُر تھا۔ اس میں وہ کھالیں اور ہڈیاں ڈال کر ان میں مٹی ڈال دیتے ہیں۔ ایک اور ثبوت اسے یہ ملا کہ اس کے گاؤں میں خود بخود کتوں کی بہبود آبادی ہونے لگی۔ اسے گاؤں کی گلیوں میں کتوں کے بھونکنے، کتوں کے لڑنے اور ایک دوسرے کو جھنجھوڑنے، بھنبھوڑنے کی آوازیں کم ہی سنائی دیتیں۔

چاچا بوٹے والا سونگ صاحب پنجابی کے ایک دو لفظ سیکھ گیا تھا۔ ایک دن اس نے اسے بلایا اور کہا "بوٹا! کُتا" چاچا بوٹے کے پاؤں تلے زمین یکایک سرک گئی جیسے کوئی بھونچال آگیا ہو۔ غصے کے مارے وہ کانپنے لگا۔ آج تک کسی نے اسے کتا کہنے کی جرات نہ کی تھی۔ اس نے سونگ صاحب کی طرف غصے سے بھری نگاہوں سے دیکھا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے کتے کی تصویر بنائی اور پھر منہ کی طرف اشارہ کر کے دائیں بائیں سر ہلایا۔ مقصد یہ تھا کہ ہم کتے کو بہت شوق سے کھاتا ہے اور اب کتا خود بخود ادھر کا رُخ نہیں کرتا۔ چاچا بوٹا سمجھ گیا کہ سونگ صاحب اس سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ وہ کئی دن تذبذب میں رہا۔ کئی بار جی چاہا کہ نوکری چھوڑ دے۔ پھر سوچا کہ کتا تو حرام مال ہے، حرام میں لگ جائے تو کیا ہرج ہے۔ وہ کتوں کو بہلا پھسلا کر کیمپ تک لے آتا۔ اس کے بعد سونگ صاحبان اور ان کے ساتھیوں کا کام تھا۔ جب گاؤں کے سردار کتے بھولو اور ڈبو بھی اس کارِ حرام میں کام آ گئے تو گاؤں میں کتوں کی مکمل طور پر بہبود آبادی ہو گئی اور رات کو نیند سکون سے آنے لگی لیکن گاؤں میں چوریاں ہونے لگیں اور ٹھیکری پہرا لگانا پڑا۔ تب اسے محسوس ہوا کہ وہ اچھا کام نہیں کرتا رہا، وہ کتوں کی نسل کشی کرتا رہا ہے۔ یہ خیال اس کے ضمیر کو کئی دنوں تک کچوکے لگاتا رہا۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے سوچا "لوگ کہتے ہیں کہ سونگ صاحبان نے اس سڑک کا ٹھیکا لینے کے لئے کچھ بڑے بڑے لوگوں کو لاکھوں کروڑوں دے کر خوش کیا تھا اور میں نے تو ایک پیسہ بھی نہ لیا، صرف اپنی نوکری بچائی یا سونگ صاحب سے اپنی دوستی نبھاہی۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ موٹروے بن گئی۔ اتنی صاف شفاف، ہموار

راستے میں جہاں جی چاہتا، کار کھڑی کر کے جنگلے سے پرے عوام سے علیک سلیک کر لیتا اور پوچھتا کہ موٹروے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ کوئی چپ رہتا، کوئی تعریف کر دیتا، کوئی شکایت بھی کہ اس نے دیہات کو تقسیم کر دیا ہے۔ کوئی کہتا میرا آدھا باغ کنوؤں کا ادھر رہ گیا ہے، اور آدھا ادھر ہے۔ وہ سب کے مسائل سنتا اور غور کرتا۔ کسی کو سو پچاس کا انعام بھی دے دیتا۔ ایک بار اس نے جنگلے کے اس پار ایک مکان کے صحن میں سردیوں کی دھوپ میں بیٹھی ایک خاتون کو دیکھا کہ وہ لسّی رڑک رہی ہے۔ اس نے کار کھڑی کی اور لسّی کا ایک گلاس طلب کیا اور خاتون کے ہاتھ میں پانچ سو کا نوٹ تھما دیا۔ چاچا بوٹا سوچتا کہ کاش وہ مجھے بھی جنگلے سے لگا ہوا دیکھ لے اور میں ہاتھ ہلا کر اس کا استقبال کروں تو وہ کار کھڑی کرے اور مجھ سے علیک سلیک کرے اور موٹروے کے بارے میں پوچھے تو میں کہوں "صاحب! میں نے موٹروے پر چار پانچ سال کام کیا ہے۔ یہ تیرا بہت بڑا کارنامہ ہے اور میرا بھی۔ چنانچہ مجھے تو اس سے بہت محبت ہے۔" وہ خوش ہو کر کہتا کہ مانگ جو کچھ مانگنا ہے۔ اور میں کہتا کہ صاحب مجھے کار پر بٹھا کر موٹروے کی سیر کرا دو۔ یہ خواب اتنے تزک و احتشام سے تو پورا نہ ہوا البتہ قدرت نے اسے موٹروے پر سفر کرنے کا ضرور موقع فراہم کر دیا۔ اس کی برادری کی ایک بارات نے بھلوال کے قریب کسی چک میں جانا تھا اور بارات والی بس نے شیخوپورہ پوائنٹ سے سالم پوائنٹ تک موٹروے پر سفر کرنا تھا۔ چاچا بوٹا بھی باراتیوں میں شامل تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک سرکردہ باراتی تھا۔ چاچا بوٹا بہت خوش تھا۔ اس نے بارات میں شامل ہونے کے لئے سفید کپڑے کا نیا جوڑا سلوایا تھا۔ پاؤں میں کھسا تھا جو ایسے موقعوں کے لئے سنبھال کر گھر میں رکھا جاتا ہے اور جو کچھ سُوکھ سَاکھ کر تنگ بھی ہو جاتا ہے اور سر پر ململ کی سفید پگڑی۔ کندھے پر صافہ۔ صبح صبح اس نے معمول کے مطابق گھر سے لسّی کے دو کٹورے پیئے تھے۔ ناشتہ اس نے بارات والوں کے ہاں کر کیا۔ انہوں یہ تکلف کیا تھا کہ لسّی کی بجائے پستے بادام والی سبز چائے سے باراتیوں

کی تواضع کی تھی اور مٹھائی بھی کھلائی تھی۔ چائے بہت لذیذ تھی۔ وہ دو تین پیالے چڑھا گیا۔

بس موٹروے پر دوڑنے لگی تو چاچا بوٹے کو یوں لگا جیسے وہ ہوائی جہاز پر اُڑ رہا ہو۔ واضح رہے کہ چاچا بوٹے کے دل میں ہوائی جہاز پر اُڑنے کا ارمان بھی موجود ہے۔ بس کے اندر بہت رونق تھی۔ سانولی سلونی خانہ بدوش مٹیاریں گڈوی بجا کر گانے گا رہی تھیں اور نوجوان باراتی ان سے ہنسی مذاق کر رہے تھے لیکن چاچا بوٹا ہنسی تماشے سے بے نیاز شیشے سے آنکھیں چپکائے باہر کے نظاروں میں محو تھا۔ دُور تک پھیلے ہوئے کھیت ایسے لگ رہے تھے جیسے قدرت کے درزی نے رنگ برنگے ٹکڑوں کی ایک چادر سی زمین پر بچھا دی ہو۔ کسی کسی کھیت میں سرسوں پھول رہی تھی اور دھوپ کا سنہری رنگ زردی میں گھل مل گیا تھا۔ کچھ کھیتوں کے کناروں پر پاپلر سبز پوش سنتریوں کی طرح کھڑے تھے اور بہت بھلے لگ رہے تھے۔

چاچا بوٹا اس نظارے میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک گھنی لسی کے کٹوروں اور سبز چائے کے پیالوں میں طوفان آ گیا۔ اس نے اس طوفان کو بہلانے پھسلانے کی بہتری کوشش کی لیکن وہ بہت ضدی تھا۔ تب وہ لمحہ آیا جب باہر کا ہر نظارہ اس طوفان میں سما گیا اور کوئی چیز نہ سنہری رہی' نہ سبز' نہ زرد۔ پاپلر اسے اشارے کرنے لگے کہ طوفان سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے تو ہماری اوٹ میں آ جاؤ۔ وہ کچھ دیر طوفان سے لڑا' پھر اس نے ہتھیار ڈال دئے اور پکار کر کہا "بھائی ڈرائیور! بس روکو!" وجہ معلوم کر کے ڈرائیور نے الٹا پوچھا "چوہدری! پانچ سو روپے جرمانہ کون دے گا؟" چاچا بوٹے نے چیخ کر کہا "میں دوں گا۔ میں دوں گا۔"

ڈرائیور نے ناچار بس روک لی۔ چاچا بوٹا بس سے کود کر اُترا اور تیر کی طرح جنگلے کی طرف گیا اور جنگلے کے اوپر سے کود کر باہر جانے کی مہلت نہیں تھی' چنانچہ جنگلے کے ادھر ہی کچی جگہ پر بیٹھ گیا۔ جب سکون حاصل ہوا تو سڑک کی طرف لپکا۔ یہ دیکھ

کر حیران رہ گیا کہ اس کی بس کالے رنگ کی ایک نئی نویلی خوبصورت جیپ میں بدل گئی ہے اور ایک نوکیلی مونچھوں والا باوردی پولس آفسر اسے نہایت خوفناک آنکھوں سے گھور رہا ہے۔ ایک پولس والا سٹیرنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ افسر نے پوچھا "پانچ سو روپے جرمانے کے ہیں تمہارے پاس؟"

"نہیں جناب!" چاچا بوٹے نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"پھر تین مہینے کی قید کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

چاچا بوٹا ذہنی، جسمانی، روحانی ہر لحاظ سے قید کے لئے فوراً تیار ہو گیا۔ اس لئے اس میں کچھ جرات مندی پیدا ہو گئی۔ اس نے کہا "جناب! میں قید کے لئے تیار ہوں لیکن مجھے اتنا بتا دیا جائے کہ کیوں؟" پولیس افسر نے اس کچی جگہ کی طرف اشارہ کر کے کہ جہاں چاچا بوٹے نے ابھی ابھی سکون حاصل کیا تھا، کہا "جانتے ہو! وہ جگہ کس کی ہے؟"

"سرکار کی۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے سرکار کی ہے لیکن یہ موٹروے کا ایک حصہ ہے۔" پولیس افسر نے کہا۔

"تو یہ جگہ میت کے صحن کی طرح پاک ہو چکی ہے جناب؟"

پولس افسر اس سوال کا جواب سوچ رہا تھا کہ چاچا بوٹے نے کہا "جناب! اگر کہیں سے کوئی کسّی یا بیلچہ مل جائے تو میں ابھی بتا سکتا ہوں کہ یہ جگہ کتنی پاک ہے؟"

افسر کچھ دیر خاموش رہا تو اس نے کہا "میں یہاں سے جتنی آپ چاہیں کتوں کی کھالیں اور ہڈیاں برآمد کر سکتا ہوں۔" پولیس افسر ششدر رہ گیا۔ چاچا بوٹے نے اسے سونگ صاحب والا قصہ سنایا تو وہ ہنسنے لگا اور اس کے چہرے کے نقوش کچھ نرم پڑ گئے۔ جب اس نے لسی اور چائے کے کٹوروں اور پیالوں میں آنے والے طوفان کی کہانی سنائی تو وہ اتنا ہنسا کہ اُس کی مونچھوں کے بل ڈھیلے پڑ گئے اور یکایک اُسے اُس کا

چہرہ ایک پولس والے کا نہیں، ایک عام انسان کا نظر آنے لگا۔

اُس نے پوچھا "میں اگر تمہیں سالم پوائنٹ سے بھلوال جانے والی کسی بس پر سوار کرا دوں تو کیا تم شادی والے چک میں پہنچ سکو گے؟"

"نہیں جناب مجھے تو اس کا نمبر اور نام بھی یاد نہیں۔" چاچا بُوٹا بولا۔ "میں تو موٹروے کی سیر کے لئے بارات میں شامل ہوا۔ اجازت دیں تو میں جنگلے پر سے کود جاؤں۔"

"نہیں!" افسر نے کہا "میں مزید قانون شکنی کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

تب اُس نے اسے جِیپ میں سوار کیا اور پنڈی بھٹیاں پوائنٹ سے مُڑ کر واپس شیخوپورہ لے آیا اور اِس سے ہاتھ ملا کر کہا "خدا حافظ! چودھری بُوٹا!"

چودھری بوٹا بگ ٹُٹ دوڑا اور اس سڑک پر پہنچ گیا جو لاہور سے شیخوپورہ جاتی ہے۔ وہ دوڑا اس لئے کہ کیا پتہ وہ اچھا انسان کب پھر پولس والا بن جائے۔ ایک بس نے اسے سوار کیا۔ وہ اپنے بس سٹاپ پر اُترا تو وہاں اسے کوئی تانگہ یا ریڑھا نہ ملا۔ چنانچہ وہ پیدل ہی گاؤں پہنچا۔ سُوکھے سٹرے کھُستے نے رستے میں اس کے پاؤں کو خوب کاٹا۔

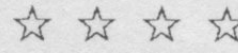
بارات تو اگلے روز واپس آئی لیکن چاچا بُوٹے نے چوپال میں بیٹھ کر اپنا قصہ سنایا تو حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔ چاچا بُوٹے نے ان سے بڑے فخر سے کہا "یارو! کتنے مزدور ایسے ہیں جنہیں موٹروے پر سفر کرنے کا موقع ملا ہے؟" سبھی نے کہا کہ ہمیں تو تیرے سوا کسی ایسے مزدور کا علم نہیں۔

پھر اُس نے پوچھا "یارو! کیا پولس اتنی ہی نیک ہو گئی ہے یا میری کوئی نیکی کام آ گئی ہے؟" اصل میں یہ سوال اس نے اپنے آپ سے پوچھا تھا تاہم حاضرین میں سے بھی کوئی اِس کا جواب دینے پر آمادہ نہ ہوا۔

میرے جیسا کوئی سقراط یا بقراط اس محفل میں بیٹھا ہوتا تو کہتا "چاچا بُوٹے!

سارجنٹ سے کپتان تک، پٹواری سے تحصیلدار تک، چپڑاسی سے ڈپٹی کمشنر تک جو بھی اقتدار کے سٹول یا کُرسی پر بیٹھتا ہے، اس کے لاشعور میں ایک "بادشاہ" بھی براجمان ہوتا ہے جو کبھی سلام کرنے پر ناراض ہو جاتا ہے اور کبھی گالی دینے پر خلعت سے بھی نوازتا ہے۔ یہی وہ شاہانہ جذبہ تھا کہ تمہیں جیپ پر موٹروے کی سیر کراتا رہا اور جس نے تمہارا جُرمانہ بھی معاف کر دیا اور قید بھی--- چودھری بُوٹے! یہی سمجھ کہ تیری کوئی نیکی کام آگئی ہے!"

(نومبر ۱۹۹۹ء)



پلیٹ فارم پر کھڑا اکیلا مسافر

آج سے چار پانچ سال پہلے کی بات ہے کہ میں نے ایک خواب دیکھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک اکیلا مسافر ہوں جو پلیٹ فارم پر کھڑا ہے' ایک گاڑی نکل گئی ہے اور دوسری کا انتظار کر رہا ہے۔ پورا خواب سنانے سے پہلے میں ایک تمہید بھی باندھنا چاہتا ہوں۔ تمہید نہیں بلکہ خوابوں کی ایک زنجیر بنانا چاہتا ہوں۔

میں نے دیکھا کہ میں کسی سفر پر نکلا ہوں۔ اس سفر میں سفر والی کوئی بات نہیں تھی کہ اس کی منزل متعین نہیں تھی۔ پھر بھی مجھے یہ سفر بے مقصد معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ اس میں سیر و سیاحت کا عنصر بھی موجود تھا۔ میں ایک سیلانی تھا کہ نامعلوم اور غیر واضح پگڈنڈیوں پر گزر رہا تھا اور پگڈنڈیاں ایک دوسرے کو کاٹ رہی تھیں۔ کسی راستے پر ٹیلے آئے' کسی میں مٹی کے تودے' ایک راستہ ایک ہموار چٹیل میدان میں سے گزر رہا تھا جو ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ پھر اچانک ایک ایسی شاہراہ تک جا پہنچا جو ایک دریا کے متوازی چل رہی تھی۔ متوازی کہوں یا یہ کہ اس شاہراہ کو دریا کے عین کنارے پر بچھایا گیا تھا جیسے سمندر کے بیچ پر "پرام" تعمیر ہوتی ہے۔ دریا بھی طوفانی کہ لہریں میرے قدموں سے لپٹتی تھیں۔ پاٹ اتنا وسیع کہ دریا کا دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھار دریا میں اتنی بڑی لہر اٹھتی اور سڑک سے ٹکراتی کہ میں اپنے پاؤں میں کپکپاہٹ محسوس کرتا۔ کبھی محسوس ہوتا کہ میں دریا کے بہاؤ کے ساتھ سیدھی سمت میں چل رہا ہوں اور کبھی اُلٹی سمت میں۔ اچانک ایک جگہ ایسی آئی کہ سڑک دریا میں گم ہو گئی اور اس کا دوسرا کنارہ اُفق کی پہنائی میں اور دریا پر کوئی پل بھی نہیں تھا۔۔۔

پھر اچانک خواب نے اپنا رُخ موڑ لیا۔ یوں لگا جیسے آسمان پر بادل چھا گئے ہوں اور پھوار پڑنے لگی ہو اور میں اپنے آپ کو ایک نہایت سرسبز پارک میں ایک چھتر کے نیچے پناہ گزیں پاتا ہوں--- میں سرشاری کی ایک کیفیت بھی محسوس کر رہا ہوں اور افسوس کی چبھن بھی کہ میرا سفر اُدھورا رہ گیا---

ایک خواب میں نے دیکھا کہ میں ایک پگڈنڈی پر چل رہا ہوں۔ میرے آگے پیچھے بہت سے آدمی ہیں جو ایک ہی قطار میں چل رہے ہیں۔ اس پگڈنڈی کے ایک طرف ایک لاانتہا دریا بہہ رہا ہے اور دوسری طرف اونچی نیچی چٹانیں اور کھڈیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب مسافر ہیں جو صبح و شام چلنے پر مجبور ہیں اور منزل متعین نہیں۔ ہم ایک دوسرے سے اجنبی ہیں۔ کوئی پچھلا اگلے سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں کرتا، سبھی نپے تُلے قدم اٹھا رہے ہیں کہ فاصلے قائم رہیں--- تب اچانک سب لوگ غائب ہو جاتے ہیں اور میں تنہا رہ جاتا ہوں۔ میں نہیں چل رہا ہوتا بلکہ پگڈنڈی چل رہی ہوتی ہے۔ پگڈنڈی ایک قلعے کے دروازے پر پہنچتی ہے اور دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ اس کے پَٹ اپنی چولوں پر گھومتے ہیں، تو گڑگڑاہٹ سی پیدا ہوتی ہے--- دروازے سے گزرتا ہوں تو اس کے پٹ خود بخود بند ہونے لگتے ہیں۔ میں ان کی ریں ریں کی آواز سنتا ہوں۔ میں ایک سڑک پر ہو لیتا ہوں جو نشیب کی طرف دوڑ رہی ہے، تنہا سڑک جس کے دونوں طرف پتھروں کی دیواریں ہیں۔ اچانک دبڑ دبڑ کی آوازیں آتی ہیں۔ دیکھتا ہوں تو نیچے سے اوپر کی طرف گرانڈیل سیاہ رنگ کی بھینسوں کا ایک ریوڑ چلا آ رہا ہے۔ میں ایک دیوار کے ساتھ لگ جاتا ہوں۔ ریوڑ کے آگے آگے ایک ہاتھی کی ہاتھی بھینس ہے کہ جس کے سینگ مڑے ہوئے ہیں اور اتنا بڑا سر ہے کہ وہ پھاٹک پر لگے تو پَٹ توڑ دے۔ یہ بھینس مجھے بڑی بڑی آنکھوں سے گھَورتی ہوئی میرے پاس سے گزر جاتی ہے--- میری نتھنوں میں وہ بو آتی ہے جو بھینس سے مخصوص ہے۔ ریوڑ گزر جاتا ہے تو میں پھر نشیب میں اُترنے لگتا ہوں اور

اچانک ایک شہر خموشاں میں پہنچ جاتا ہوں۔ اتنی بڑی بڑی خوبصورت عمارتیں ہیں کہ آسمان کی خبر لاتی ہیں۔ کشادہ سڑکیں، سرسبز پارک، سڑکوں کے کناروں پر رنگ برنگے پھولوں کے تختے بچھے ہیں لیکن یہ شہر خالی ہے۔ الف لیلہ کا وہ شہر جسے جِن کھا گیا ہے---

ایک عرصے سے میں دو قسم کے خواب دیکھ رہا ہوں۔ مراجعاتی خواب اور بے سروسامانی کے عالم میں کسی سفر کے خواب--- ظاہر ہے کہ مراجعت ماضی میں ہوتی ہے، کبھی زمانی، کسی مکانی بلکہ اکثر زمان و مکاں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ کبھی مراجعت میں خوشی ملتی ہے، کبھی غم۔ اکثر اپنے گاؤں کو لوٹتا ہوں اور گاؤں بھی بچپن کا گاؤں۔ کبھی اس کی گلیاں تنہا اور سونی ہوتی ہیں، کبھی اتنی گنجان آباد کہ رستہ نہیں ملتا۔ ہر مراجعت پر گاؤں کا نقشہ بدلا ہوتا ہے۔ اس کا "حدودِاربعہ" بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ کئی بار میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹے گیج کا ریلوے ٹریک سیالکوٹ شہر کے سٹیشن سے شروع ہو کر چھاؤنی سے گزر کر میرے گاؤں کے ایک کنارے سے گزرتا ہے اور دریائے چناب کی طرف چلا جاتا ہے۔ یہ خواب میرے بچپن کا ساتھی ہے۔ ٹریک کے دونوں کناروں پر مجھے شیشم کے بوڑھے درختوں کا سایہ اس وقت بھی نظر آتا تھا اور اب بھی۔ جب میں بی ٹی میں پڑھتا تھا تو ہمیں شملہ میں سکاؤٹنگ کے لئے لے جایا گیا۔ کالکا سے میں چھوٹے گیج کے ریلوے ٹریک پر چلنے والی گاڑی میں بیٹھا تو میرے بچپن کا یہ خواب لوٹ آیا یا شرمندۂ تعبیر ہو گیا لیکن اب بھی یہ خواب میرے لاشعور سے رخصت نہیں ہوا۔ خوبصورت چھوٹے ڈبوں والی ٹرین کو ٹریک پر چلتے ہوئے دیکھتا رہتا ہوں۔ اس میں بہت لطف آتا ہے۔ اس کے ننھے دُخانی انجن سے جو دھواں اٹھ کر فضا میں مرغولے بناتا ہے، وہ بھی میری آنکھوں کے سامنے لہراتا ہے۔ میں انجن کی وسل کی آواز بھی سنتا ہوں۔ چھک چھک کی آواز بھی آتی ہے۔ گاڑی میرے گاؤں کے چھوٹے سے خوبصورت ریلوے سٹیشن پر رکتی بھی ہے لیکن میں اس میں سوار نہیں

ہو تا---

ان دنوں میں جو خواب دیکھ رہا ہوں، نہایت بے سروپا ہوتے ہیں۔ اکثر عجیب نوعیت کی بے سرو سامانی کا عالم ہوتا ہے۔ میں نقلِ مکانی و زمانی کی کیفیت میں ہوتا ہوں اور بے سروسامانی اس پر مستزاد۔ ایسے خوابوں کے درمیان انتہائی دل گرفتگی کی اذیت میں مبتلا رہتا ہوں۔ اکثر زمانہ ء ماضی کی طرف لوٹ جاتا ہوں۔ ایک ایسے شہر کے سکول یا کالج میں پڑھانے پر مامور ہوتا ہوں، جس کا ماحول اور جس کی فضا دل کو اداس کرتے ہیں۔ کسی شہر میں رہنے کو مکان نہیں ملتا، کسی شہر کی گلیاں اتنی تنگ اور ٹیڑھی بینگی ہیں کہ ان میں کھو کر بھُول جاتا ہوں کہ یہاں کیوں آیا۔ عام طور اکیلا ہوتا ہوں، اکثر اس مکان کا اتا پتا بھول جاتا ہوں، جہاں میری رہائش ہے۔ کبھی ایک ایسے کمرے میں ٹھہرا ہوتا ہوں جہاں بہت سے مہمان ٹھُنسے ہوئے ہیں اور یہاں میں بھُول جاتا ہوں کہ میرے کپڑے کہاں ہیں، قمیص ہے تو شلوار نہیں۔ بعض اوقات صرف ایک تہبند زیر بر ہوتا ہے اور پاؤں کا جوتا بھی غائب ہوتا ہے۔ اس نیم عریانی پر دل تنگ ہوتا ہے، شرم بھی آتی ہے--- مسافر اور زادراہ لازم و ملزوم ہیں--- ایک منزل ایسی بھی ہوتی ہے کہ جہاں ہر سفری کا اسباب راہ میں لٹ جاتا ہے---

ایسے ہی ایک سفر میں مجھ پر نیم عریانی کا عالم تو طاری نہیں لیکن بے سرو سامانی کی کیفیت شدید ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں جانا ہے۔ ایک خوف لاحق ہے کہ منزل دُور ہے اور زادِراہ کے کم پڑنے کا اندیشہ بھی ہے۔ نجانے کہاں کہاں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ جھُٹپٹے کا وقت ہے ایسے میں سفید کپڑوں میں ملبوس ایک ہیولیٰ میرا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ میں ہاتھ کے لمس ہی سے محسوس کرلیتا ہوں کہ میرے والد کا ہاتھ ہے۔ وہ مجھ سے نہیں پوچھتے کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو۔ ایک عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں، وہ رہا سٹیشن جہاں سے ہم گاڑی پر سوار ہوں گے۔ اچانک گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے کہ اس میں میں اپنے والد کو تو کیا، اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔

ایک اوراک سا باقی رہ جاتا ہے کہ وہ بھی ہیں اور میں بھی ہوں۔ سٹیشن کی عمارت بھی نظر نہیں آتی۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی فلیگ سٹیشن ہے جہاں سے تیز رفتار گاڑیاں دندناتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ ایک مدھم سی روشنی ضرور نظر آتی ہے۔ احساس کہتا ہے کہ یہ ٹکٹ بابو کی کھڑکی ہے۔ میرے والد منہ سے نہیں بولتے لیکن اپنا ایک خیال میرے ذہن میں منتقل کر دیتے ہیں کہ تم پلیٹ فارم پر چلو' میں ٹکٹ لے کر آتا ہوں---

پھر میں اپنے آپ کو پلیٹ فارم پر پاتا ہوں۔ اتنا گھُپ اندھیرا ہے کہ پلیٹ فارم محسوس ہوتا ہے' نظر نہیں آتا۔ اس دبیز اندھیرے میں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے گاڑی آ رہی ہے' بریکیں لگتی ہیں اور میں ان کی آواز سنتا ہوں' گاڑی رُکتی ہے' اس کے کسی ڈبے میں روشنی نہیں ہے۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ اس گاڑی میں میری والدہ اور میری شریکِ حیات بھی سوار ہیں۔ میں اپنے دل پر بہت دباؤ محسوس کرتا ہوں کہ گاڑی چل جائے گی اور والد ابھی ٹکٹ لے کر نہیں پہنچے--- تب گاڑی کے چلنے کی آواز آتی ہے اور پلیٹ فارم کا گہرا اندھیرا اس آواز کو کھا جاتا ہے اور اس اندھیرے میں مَیں اپنے آپ کو یکہ و تنہا پاتا ہوں اور بہت اُداس اور دل گرفتہ بھی!

اب اس لمحے بھی میں ایک اندھیرے پلیٹ فارم پر اکیلا کھڑا ہوں۔ ایک گاڑی گزر گئی ہے اور دوسری گاڑی کا انتظار کر رہا ہوں۔

(جولائی ۲۰۰۱ء)

☆ ☆ ☆ ☆

غلام الثقلّین نقوی

12 مارچ 1923ء کو مقبوضہ جموں کشمیر کے ایک گاؤں چوکی ''ہنڈن''، ضلع نوشہرہ میں پیدا ہوئے، جہاں اُن کے والد سید امیر شاہ مرحوم بہ سلسلہ ملازمت مقیم تھے!

اسکول ریکارڈ کے مطابق اُن کی تاریخ پیدائش 21 مئی 1923ء ہے۔ آبائی گاؤں کا نام ''بھڈتھ'' ہے جو سیالکوٹ شہر سے شمال کی طرف 3 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہیں اُن کے بچپن اور لڑکپن کا بیشتر حصہ گزرا!

پرائمری اسکول ''بڈتھ'' اسکاچ مشین اسکول سیالکوٹ چھاؤنی، ڈی بی ہائی اسکول دیپالپور، مرے کالج سیالکوٹ اور سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیمی قابلیت ایم اے (اُردو) بی ٹی ہے!

37 سال تک درس وتدریس کے پیشے سے منسلک رہ کر 20 مئی 1983ء کو گورنمنٹ کالج لاہور سے اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو) کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ 4 بیٹے اور ایک بیٹی ہے!

آج کل مکان نمبر 100، بلاک A-4، پنجاب گورنمنٹ ایمپلائز کواپریٹو، ہاؤسنگ سوسائٹی لاہور میں مقیم ہیں!